معیار
Maiyar

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

جلد ـــــ ۵
نمبر ـــــ ۴
اپریل ۱۹۵۵ء

مدیر

نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیل زر اور تبادلہ زر کیلئے

دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فہیم ملی لائن جیکب آباد

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترتیب

نظمیں

مقالے

غزلیں

افسانے

مضامین

نقشِ اوّل

پچھلی بار انہی صفحات میں ادب کی تخلیقی نوعیت کے ذہنی پہلو کو چھیڑا گیا تھا۔ بات معلوم نہیں آپ کو کیسی لگی تشنگی کی شکایت کا تو سوال نہیں۔ دو صفحے ہوتے ہی کیا ہیں۔ لکھنے والا زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ ان باتوں کو ایک مختصر مضمون کی سی شکل دے دے۔ اب اسی شکل کو چاہے Formal essay کی صورت دے دیجئے یا انہیں Frame work بنا کر تھوڑی دیر کو گپ شپ کا سامان مہیا کر دیجئے۔ گپ شپ کا تو یہاں کوئی موقع نہیں۔ اب رہ گیا Formal essay تو ایک حد تک آپ کو اس کی جھلک مل سکتی ہے۔ اور میرے خیال میں اس سے زیادہ طوالت کسی ایسی تحریر میں ہونی بھی نہیں چاہئے خصوصاً جبکہ موضوع گپ شپ کی قسم کا نہ ہو۔ نقشِ اول کا مقصد جہاں تک معیار کے پیشِ نظر رہتا ہے وہ یہ ہے کہ تھوڑا بہت جو کچھ بھی لکھنے کا موقع ملے اس میں کوئی بات ایسی ہو کہ ہماری بڑھتی ہوئی تخلیقی جد و جہد کے مطالبوں کو پورا کرنے پر اکسا سکے۔ مقصود یہ نہیں ہے کہ ان دو صفحات میں سارے مطالبے خود ہی پورے کرنے کی کوشش کی جائے۔ بس ایک آدمی اتنا کرنا چاہتا ہے کہ آپ کو وقت کی ضرورت کا احساس دلا کر آپ کی قوتِ فکر کو تحریک دلا دے۔ اور اگر اس میں کسی حد تک بھی کامیابی ہو جائے تو سمجھئے بڑی چیز حاصل ہو گئی۔ قوتِ فکر کی پائندگی ایسی چیز ہے جو بے جان سے بے جان موضوع میں بھی بلا کی روح پھونک دیتی ہے۔ ابھی تک ایک یہ خیال عام رہا ہے کہ شعری اور فکری صلاحیتیں بالکلیہ وجدانی ہوتی ہیں۔ اور وجدانی بھی ایسی کہ سرخوشی کے عالم کی کوئی حد، کوئی اصول، کوئی ضابطہ ہی نہیں۔ اسی لئے آپ اِدھر اُدھر نظر اٹھا کر دیکھ لیجئے صحیح معنوں میں لکھے پڑھے فن کار کم ہی ہیں برخلاف اس کے سطحی اور ردّی سے ٹھوس نے، ٹھانسے، بے جد و جہد کئے ملے جلے علم پر جسے علم کا عکس بھی مشکل سے کہا جا سکتا ہے بہتوں کی گاڑی زندگی بھر جیسے تیسے لڑھکتی رہتی ہے۔ ٹیپو کو لے لیجئے۔ کہ ان حضرت نے انتہا کر دی بارش بر بھی کچھ لکھنے بیٹھے تو بجائے کھڑکی کے باہر جھانک کر برستی ہوئی بارش کو دیکھنے کے، ادب لطیف کو الٹا پلٹا اور نظم تیار، اور اس کے نتائج سب کو معلوم ہے کہ اسکے نتائج کیا ہیں۔

مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ علم و فن کے سائنسی نظریہ کا اثر بڑھ رہا ہے، اور ادب بھی اس سے الگ نہیں ہیں۔ سائنس نے بہت سی باتوں کو جنہیں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا حقیقتِ ثانیہ کی صورت دی ہے۔ اس نظریہ کو بہت سے ذہنی ردّ عمل دیکھنے پڑے ہیں۔ پہلے سائنس کو مادیت کا ہم معنی سمجھا گیا اسکے اصولوں کے زیر اثر لادینی تصورات کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً عمل اور ردّ عمل کا اصول جدلیاتی مادیت میں ڈھل گیا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ وہ خیال جو سائنس کی جس پسند روح کو الوہی علوم کے منافی سمجھتا تھا اب تصحیح کی منزل سے گزر چکا اور غور و فکر کا طالب ہے۔ سائنس محض کائنات کے تکوینی اسرار کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ تاہم اسے دوسرے مقاصد کے لئے بھی کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ حق کی خدمت بھی کر سکتی ہے۔ بس توجہ کی ضرورت ہے اور یہ ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔ ہماری فکری قوتوں پر اس کا اثر تیزی سے پڑ رہا ہے۔ بجا ہیں سال بعد کے ادب کے بارے میں اور ادب کیا ہے تخلیقی فن کے بارے میں حیرت انگیز اندازے قائم کئے جا سکتے ہیں۔

ایک چیز جس کو شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ انسانی ذہن تجزیہ و تحلیل کی ایسی منزل میں قدم رکھ رہا ہے جہاں طبیعی اور نفسی علوم کی سرحدیں مل گئی ہیں۔ پہلے کائناتی شواہد کو نفسی اور وجدانی علوم کی ترازو میں تولا جاتا تھا اب حالت برعکس ہو گئی کائنات کے شواہد سے حقائق مرتب کرنے لگے ہیں اور اسی کے سانچوں میں نفسی علوم کو ڈھالا جا رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں ذہنی کش مکش کے بے پناہ امکانات موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے پہلے کی طرح آج بھی بحثیں زیادہ اٹھ رہی ہیں اور اچھے نتائج نہیں نکل رہے ہیں، باوجود اس کے کہ تجزیاتی و تحلیلی تنقید کے اصول اب ہمارے سامنے پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو کر آ چکے ہیں۔

نظامِ کائنات کی وہ دو بنیادی صورتیں جن پر ابو الاعلیٰ کے یہاں "تکوینی" اور "تشریعی" اصطلاحات کے تحت بحث کی گئی ہے۔ ہمارے لئے آج پہلے سے زیادہ اہم ہیں۔ ابو الاعلیٰ نے دونوں کی ہم آہنگی اور توافق پر فلسفیانہ افکار کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ توافق اسلامی نظریہ کی روح ہے۔ مگر آج کے دوسرے

ارباب فکر کے تضاد کو دیکھئے کہ تکوینی نظام کو مادی قوتوں کے زیر اثر ان لینے میں انہیں نہ کوئی تامل ہے نہ کوئی اہمیت نظر آتی ہے لیکن اختیاری پہلو پر بحث کرتے ہوئے وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسی زندگی اور کائنات کا ایک حصہ جس کی تسخیر کے لئے ہم فکر کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ ہماری دسترس سے باہر بھی ہے اور اس سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ اسی ہم آہنگی پر ودیگر ابو الاعلیٰ نے سائنسی نظریہ علم کی ایک نئی تحقیق کے امکانات روشن کئے ہیں۔

تکوینی نظام کے اسرار کی نقاب کشائی سائنس کر رہی ہے اور تشریعی نظام کی باگ دوڑ جن نظریوں اور فلسفوں کے ہاتھوں میں ہے ان کا تضاد پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ بحالت موجودہ دونوں میں ہم آہنگی نہیں ہو سکتی تا آنکہ کوئی واحد بنیاد جو بیک وقت بنیاد اور بقول شخصے Mighty Idea کا کام انجام دے دماغ ہو کر مقبول ہو جائے!

ایسا ممکن ہے اور اس ممکن کو سچ کر دکھانے کی ایک شدید ترین جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس دوڑ میں ان لوگوں کو بھی حصہ لینا ہے جو اسلامی فکر کے تعمیری و تخلیقی میلانات اپنا کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ سائنس کو برا بھلا کہنے کا زمانہ کبھی کا گزر چکا ہے اب ضرورت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور آج ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں سائنس اور مابعد الطبیعیات کو ایک کر دکھانے کا قریب بھی کھل چکا ہے، اگرچہ جدید مفکرین ابھی تک اس وادی میں بھٹک رہے ہیں ان میں سے اگر کچھ کو Life Force کی اصطلاح مل گئی ہے تو اسے کیا کیجئے یہ قوت ان کے نزدیک کائنات اور اس کی سب سے اہم تخلیق انسان سے ہم آہنگ نہیں بلکہ ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ ایک بڑا سانحہ ہے جو شاکے "شرماور نوق البشر" میں دیکھا جا سکتا ہے

یہ بھاری کمی اگر پوری ہو سکتی ہے تو اسلامی نظام فکر کی روشنی میں۔ اس کی کامیابی جس بات پر منحصر ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تکوینی اور تشریعی قوانین کے سرچشمہ کو ایک تسلیم کر لیا جائے اس کے بعد توافق کے نظریہ پر ایک بہتر شے تعمیر ہو سکتی ہے۔

یہاں اس سلسلے میں تنقید اور سائنس کے تعلق پر خاص طور سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اس دور میں سب لوگ Judgement کا نام سن کر ہی تنقید کو برا بھلا کہنے لگتے تھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ استقرائی انداز تنقید میں تیزی سے ترقی پذیر عنصر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اور درحقیقت سائنس اس کے حق میں ہے سائنس اسے حماقت ہی کہہ سکتی ہے کہ تجربہ تو کیا جائے، مطالعے کئے جائیں۔ تشریح اور speculation سے تو کام لیا جائے اور اس کے بعد کوئی نتیجہ نکالے بغیر بات ختم کر دی جائے تجربہ اور مشاہدہ کے بعد Inference وہی اہمیت رکھتا ہے جو تنقید میں استقرا اور تشریح کے بعد حتمی Judgement کو حاصل ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں تخلیقی ادب کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جن پر سائنس کے اثرات کے امکانات کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ تنقید کی ایک مثال اوپر پیش کر دی گئی ہے۔ یہی صورت تخلیقی صورت کی ہے۔

در حقیقت مابعد الطبیعیاتی میلانات آج کی تخلیق کا وہ جدید اوصاف امتیازی ہے دراصل تجربات علمی کے اس سائنٹیفک طرز سے تعلق رکھتا ہے جو عمل گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی صرف To determine such and such سپرد قلم کر دیتا ہے بلکہ ایک مربوط طریقہ عمل بھی دیتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ طرز انتقاد جو آج بعض حامیوں کے سبب تخلیقی فنکاروں کو بچوں کا کھیل نظر آتا ہے۔ سائنٹیفک طرز تحلیل کو پوری طرح جذب کر کے دیدہ بینا بن جائے گا۔ ابھی تک بہت سے سوالوں کے جوابات ایک سے زیادہ مل رہے ہیں لیکن ایک دن ایسا بھی آئے گا جب سوالات کا ایک اور حقیقی جواب مل جائے گا۔ اس وقت ادب اور نفسیات کو آپ علوم طبیعی کے پہلو بہ پہلو چلتا ہوا دیکھیں گے۔ مگر اس کا راستہ مادیت پرستی سے الگ پائیں گے۔ اور وہ ایک عجیب ہوگا جب انسانی افکار و اعمال کا تجزیہ اتنے ہی سلیقے سے کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے گی جتنے سلیقے سے غیر ذی حیاتی اجزائے ترکیب کا تجزیہ ہو جاتا ہے۔

فاروق بانسپاری

عورت

تنہائی سے اکتائی ہوئی فطرتِ آدم
درگاہِ خدا میں ہوئی یوں محوِ مناجات

اے خالقِ جنت ترے الطاف کے صدقے
اک پیکرِ خاکی پہ ہیں کس درجہ عنایات

وابستگیٔ بندۂ مجبور کی خاطر
کیا کیا نہ دکھائے تری قدرت نے کمالات

تا حدِ نظر لالہ و گل کی یہ نمائش
آغوشِ مسرت میں یہ ہنستے ہوئے لمحات

گلشن کی فضاؤں میں ترنم ہی ترنم
ہر ساز کے پردے سے نکلتے ہوئے نغمات

جس چیز کی خواہش ہو بیک آن مہیا
یہ میرے سوالات کے برجستہ جوابات

شاخوں کو یہ آئینہ دکھاتی ہوئی نہریں
یہ وجد کے عالم میں مہکتے ہوئے باغات

یہ کوثر و تسنیم کے دلچسپ نظارے
رنگینیٔ ماحول کے پرکیف اشارات

سبزے پہ چمکتی ہوئی شبنم کے یہ موتی
احساس پہ چھائی ہوئی اک تاروں بھری رات

خوشبو میں یہ ڈوبی ہوئی مستانہ ہوائیں
سینوں میں یہ انگڑائیاں لیتے ہوئے جذبات

یہ راز سمجھ میں نہیں آتا مرے آقا
بے کیف ہیں کیا جانیے کیوں زیست کے لمحات

ہر وقت کسی شئے کی کمی ہوتی ہے محسوس
مطلوب کوئی چیز ہے بے نام و نشانات

ناگاہ نہاں خانۂ قدرت کا کھلا در
ہلکا سا تبسم تھا مشیت کے لبوں پر

اک جلوۂ نادیدہ مجسم نظر آیا
آئینۂ تخلیق کا کہیے جسے جوہر

دامن میں لئے دولتِ آسائشِ گیتی
سینے میں دبائے ہوئے ہنگامۂ محشر

پلکوں پہ حیا مستِ مئے شوق نگاہیں
میٹھا سا رگِ جاں میں اُترتا ہوا نشتر

ظلمت کدۂ دہر کی وہ عظمتِ معصوم
دیتے ہیں سلامی جسے مہر و مہ و اختر

احساس کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی وہ تیغ
دارا کو سکھاتی ہے جو اندازِ سکندر

پاکیزگیٔ نفس کا رنگین مُرقع
اوڑھے ہوئے صد آیۂ تطہیر کی چادر

اِک پیکرِ خاکی میں نہاں حُسن کی دُنیا
اِک چھوٹے سے قطرے میں محبت کا سمندر

ہونٹوں پہ تبسم ہو تو نکھری ہوئی جنت
آنکھوں میں جو آنسو ہو تو بہتا ہوا کوثر

برہم ہو تو آنے لگے شعلوں کو پسینہ
شاداں ہو تو شبنم سے بھی خنکی میں فزوں تر

سختی بھی قیامت کی نزاکت بھی بلا کی
کہہ سکتا ہے پھر کون یہ شیشہ ہے کہ پتھر

آجائے اگر غیظ میں تو صُورِ سرافیل
مائل بہ سکوں ہو تو علاجِ غمِ محشر

قائم جو رہے وضع پہ اپنی تو ہمہ خیر
بڑھ جائے اگر حد سے تو سرتا بقدم شر

جنگاہِ بغاوت میں حقیقت سے بھی منکر
دھوکے پہ بھی قرباں رہِ تسلیم میں اکثر

مشہور ہے دُنیا میں جو عورت کے لقب سے
تصویرِ وفا جذبۂ ایثار کا پیکر

اُٹھا دلِ آدم میں جو طوفانِ تمنّا
اِرشاد کیا شانِ کریمی نے یہ ہنس کر

تو جس کا طلبگار ہے وہ جام یہی ہے
لے جا کہ مرا آخری اِنعام یہی ہے

محمد نیاز

دیوانہ پن!

تُو ہے مری جان و تن! تُو ہے مرا فکر و فن!
تُو ہے سخن در دہن! تُو لبِ من نغمہ زن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

سوزِ دلِ نل دمن! دردِ دلِ کوہ کن!
ہیر کے دل کی لگن! قیس کے دل کی جلن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

شعر کے نشتر کا پھل! نظم کے دل کا کنول!
جانِ عروسِ غزل! روحِ روانِ سخن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

رند کا دستِ طلب! مستیٔ ستِ طلب!
لغزشِ جستِ طلب! تیغ کی جبیں کی شکن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

مستیٔ صہبائے دید! نعرۂ ہل من مزید!
رندِ سیہ کی اُمید! مستِ خدا کا چلن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

یہ غمِ دُنیا و دیں؟ تُو ہے تو کچھ بھی نہیں!
عرش ہے میری زمیں! چرخ ہے میرا وطن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

خونِ عروقِ حیات! فاتحِ جیشِ ممات!
تجھ سے ہے مولا صفات! بندۂ خاکی بدن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

ہوش کی دنیا، جہاں! تیری ہی، مکاں لامکاں!
ایں سوئے وہم و گماں! آں سوئے تخمین و ظن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

ہم اسیرِ کمند! اور دلِ ارجمند؟
بر طرفِ قید و بند! بےغم دار و رسن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

تندہ سو و خیل و گلنگ! دیدۂ تیغ و تفنگ؟
یافتی کیدِ فرنگ؛ می نگری برہمن؟

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

رگِ من و سازِ من! قوتِ آوازِ من!
اے تو لی شہبازِ مر! ایں ہمہ زاغ و زغن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

غازی بے تیغ تیز! فاتحِ بے رستخیز!
دارِ من، شعلہ ریز! برقِ بلا سوز تن!

اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

محمود عالم

سوال ہے عصمتِ چمن کا

مرے بزرگو!
یہ عصمتِ گلستاں کے تاجر
ذلیل تاجر —— ہوس کی خاطر
مزاجِ گلشن کی آبرو کا ذلیل بیوپار کر رہے ہیں
چمن کی عصمت لٹا رہے ہیں
ہوس کی دیوی پہ گلستاں کی عظیم قدریں چڑھا رہے ہیں
یہ کیسے فتنے جگا رہے ہیں
یہ کیسا اودھم مچا رہے ہیں
مرے بزرگو —— مرے ندیمو
چمن کی عصمت کے پاسدارو
خموش کیوں ہو —— نظر اٹھاؤ
یہ دیدنی "یہ تماشا" دیکھو
کلی کلی اب ہے خوں افشاں
بہار زرد، بہار حیراں
نسیم افسردہ، گل پریشاں
نشانِ گلشن خزاں بداماں
یہاں وہاں سازشوں کے طوفاں
تمام رسوائیوں کے ساماں
تمام بربادیوں کے ساماں

مرے بزرگو!
چمن کی عظمت کے رازدارو
عظیم قدروں کے پاسدارو
خموش کیوں ہو
بایں مذاقِ چمن سرائی بتاؤ آخر خموش کیوں ہو
چمن کی عظمت سسک رہی ہے
تمام کلیاں ہیں سہمی سہمی
تمام شاخیں لرز رہی ہیں
تمام گلشن دہل رہا ہے
تمھاری غیرت کو بے بسی پھر چمن کی آواز دے رہی ہے
تمھارے عزمِ جواں سے عصمت چمن کی فریاد کر رہی ہے
تمھارے ذوقِ بہار ساماں کو ہر کلی پھر بلا رہی ہے
مرے بزرگو بایں مذاقِ چمن سرائی خموش کیوں ہو
زباں کھولو —— قدم اٹھاؤ
اٹھو گلستاں کی آبرو اک عظیم شے ہے اسے بچا لو
عظیم قدروں کی لاج رکھ لو
چمن کی عصمت کے پاسدارو
چمن کی عظمت کے رازدارو
مرے بزرگو —— مرے ندیمو

مُلّا رموزی (مرحوم)

اب کہاں!

بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں
یورپ کی پی ہے جب تو ہیں ہشیار اب کہاں

جس سے لگا کے تکیہ میں لکھتا تھا شان سے
بارش کے بعد بھائی وہ دیوار اب کہاں

جس کے ذریعہ فتح کی دنیا رسولؐ نے
اخلاق کی وہ دولت بیدار اب کہاں

توبہ کے بعد پھر نہ کبھی توڑتے تھے عہد
بی۔ اے کے عہد میں وہ گنہگار اب کہاں

سائنس سے قریب ہوئے اور خدا سے دور
ہم اس کی نعمتوں کے سزاوار اب کہاں

جب عشق بی، اے پاس ہے اور حسن بی اے پاس
ایک دوسرے کا کوئی وفادار اب کہاں

بجلی کی روشنی کی نفاست تو بجا ہے
اس شخص میں جلالت کردار اب کہاں

شعرِ زوال و شعرِ گدائی گلی گلی
اقبال کے جلال کے اشعار اب کہاں

بلند ناروی ایم اے۔

سامعین

(والٹر ڈی لا میئر Walter de la Mare کو پُراسرار فضا قائم کرنے میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ ذیل کی نظم LISENERS کا بامحاورہ منظوم ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ نظم کی پُراسرار فضائیت ایک خاص عہد سے پیدا کی گئی ہے جو دو دوستوں میں یہ عہد ہوتا ہے کہ وہ ایک مقررہ جگہ پر پھر ملیں گے۔ ان میں سے ایک ساتھی اس عہد کو پورا کرنے کے لئے سفر سے واپس آتا ہے لیکن دوسرے ساتھی مر چکے ہیں۔ جگہ سنسان ہے)

(۱)

"ہے کوئی اندر یہاں"
دی اس مسافر نے صدا
چاندنی سے جگمگاتے در پہ کھٹ کھٹ کرکے واں
خامشی میں اس کا گھوڑا چر رہا تھا گھاس کو
فرش پر اس گھاس کے میدان میں بالکل بے تکان

(۲)

پھڑپھڑاتی ایک چڑیا بُرج سے باہر اُڑی
اور مسافر سر پہ اپنے دیکھتا ہی رہ گیا
کھٹکھٹایا در یہ پھر اک بار اس نے زور سے
"ہے کوئی اندر یہاں!!"
پھر اس نے چلّا کر کہا

(۳)

کوئی بھی لینے نہیں آیا مسافر کی خبر
اور نہ اُس دہلیز پر شاخوں میں سر آیا نظر
آگے جھک کر جھانکتا جو چشمِ گردآلود کو
جب وہاں سکتے میں وہ حیران کھڑا تھا منتظر

(۴)

سننے والوں کا مگر سایوں کی مانند اک گروہ
پُرسکوں اس چاندنی میں سب کھڑا سنتا رہا
لق و دق وہ گھر نما تھا جن کا مسکن ان دنوں
آج انسانوں کی بستی کی صدا سنتا رہا

(۵)

اور اس نے دل میں سوچا
"ہیں وہ سب کتنے عجیب
ان کی خاموشی صدا کا ہے نرالا اِک جواب"

(۶)

اس نے پھر اِک بار بڑھ کر کھٹکھٹایا زور سے
اور بھی کچھ زور سے ——— اور تان کر گردن ذرا
"ان سے کہہ دینا ———
میں آیا اور نہ بولا کوئی بھی"
"میں رہا وعدہ پہ قائم"
اس نے چلا کر کہا

(۷)

سننے والوں نے نہ کی جنبش مگر پھر بھی ذرا
گو کہ ہر وہ حرف جو اس نے کیا تھا اب ادا
دیر تک اس کی، مکاں میں گونج سی ہوتی رہی
اِک وہی تنہا تھا بس جو رہ گیا تھا جاگتا

(۸)

لو نہیں آئی صدا، وہ ہو گیا پا بہ رکاب
لوہے اور پتھر سے اِک جھنکار پھر پیدا ہوئی
اور ٹپا ٹپ ٹاپ کی آواز بھی جب رک گئی
بحرِ خاموشی کی تب اِک بار پھر پیدا ہوئی

محمد عثمان رمز

غزل اور غزل گو

غزل کی بابت اتنا تو ہم سب جانتے ہیں کہ غزل اور دوسری تمام اصناف شاعری سے بالکل مختلف اور جداگانہ صنف شاعری ہے۔ اس کا ہر شعر خود ایک کائنات ہوتا ہے جس میں ایک دنیا مضمر ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ اس کے بیشتر اشعار ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اور ان میں بظاہر کوئی ربط نہیں ہوتا۔ غالباً پروفیسر کلیم نے غزل کی اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غزل کی بے ربطی اور بے تنظیمی کا شکوہ کیا ہے نہ صرف اتنا ہی بلکہ پروفیسر کلیم صاحب نے غزل کو "نیم وحشی" صنف شاعری بھی قرار دیا۔ کلیم صاحب نے کیوں ایسا کیا یہ محض گمان و قیاس کی بات ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ ان سے اتفاق نہ کریں

میں سمجھتا ہوں غزل کا ہر شعر لیبنز (Leibnitz) کا ایک مونا ڈ (Monad) ہے میں اس کی مزید تشریح کرتا ہوں۔ اس جرمن فلسفی کا خیال ہے کہ کائنات میں قوت " (Force) کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ذرات ایک دوسرے سے کسی نہ کسی پہلو سے مختلف ہیں۔ یہی مل جل کر اشیا (Things) بناتے ہیں۔ اس طرح کہ دو چیزیں کبھی آپس میں یکساں نہیں ہوتیں مگر پھر بھی مشابہت کے کچھ پہلو ہوتے ہیں۔ اس فلسفی کے مطابق یہ تمام مونا ڈ (Monad) باوجود ایک دوسرے سے مختلف اور علیحدہ ہونے Pre-established Harmony سے ربط باہم رکھتے ہیں جن کی ترتیب تنظیم اور تعکیس (Reflexion) کا کام ایک سب سے بڑا مونا ڈ (Highest monad) انجام دیتا ہے۔

بالکل غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے مختلف اور جدا نظر آتا ہے اور بذاتِ خود ایک کائنات بداماں معلوم ہوتا ہے مگر اس کی ترتیب تنظیم اور تعکیس کے لئے ایک منظم، مربوط اور مترتب شخصیت کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔ شخصیت جس قدر اپنے فکر و فلسفہ اور خیال و جذبات میں ہم آہنگی پیدا کرے گی اسی قدر غزل کے اشعار ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہوں گے۔

یہاں یہ سوال ہمارے پردۂ ذہن پر اُبھر سکتا ہے کہ غزل ہی کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت کیوں؟ دوسری اصناف شاعری میں کیا مربوط، منظم اور مترتب شخصیت کی ضرورت نہیں؟ لیکن ہم ان سوالات پر اگر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ غزل میں جو قوت متحرکہ کام کرتی ہے وہ دیگر اصناف شاعری سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہے۔ مثلاً قصائد، مثنوی اور قطعات وغیرہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مشاہدات تجربہ اور بالخصوص شعور کی کارفرمائیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک شاعر جتنا اپنے مشاہدات، تجربے اور شعور کو اپنے جذبات اور وجدان میں ضم کر لیتا ہے اتنا ہی وہ کامیاب ہوتا ہے نیز یہ کہ مشاہدات، تجربے اور شعور کی چھلنیوں سے چھن کر جو فلسفہ ان اصناف شاعری میں نظم کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر حقیقی " (Realistic) ہوتا ہے۔ مگر اس کے مقابل اگر آپ غزل کو دیکھیں تو اس میں داخلیت، وجدان اور لاشعور جیسی قوت متحرکہ کام کرتی ہوئی ملے گی، یہاں مجھے اپنے اس خیال کے کسی ایک پہلو پر زور دیکر کوئی سنسنی خیز نتیجہ اخذ کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ میری غرض صرف اتنی ہے کہ صنف غزل میں شعور کے مقابلہ میں لاشعور کا خاصا حصہ ہوتا ہے۔ ورنہ یوں تو مشاہدات و تجربات غزل میں بھی پائے جاتے ہیں اور داخلیت اور وجدان دوسری اصناف شاعری میں بھی بہ الفاظ دیگر غزل اور دوسری اصناف شاعری میں مشاہدات و تجربے، داخلیت و خارجیت، فکر و فلسفہ اور سب سے اہم، شعور و لاشعور کے تناسب میں فرق ہے نہ کہ نوعیت میں۔

اب میں آپ کے سامنے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ غالب اپنے

ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ان اشعار میں آپ مشاہدات اور تجربے کے امتزاج کو دیکھ سکتے ہیں۔
اس سے زیادہ مکمل اور کامیاب مثال حالی کی نظم "بیوہ کی فریاد" سے دی جا سکتی ہے۔ حالی اس نظم میں لکھتے ہیں ؎

رونا ان بن باسیوں کا کیا — دیس نکالا جن کو ملا ہے
اب تو مارے خواہ نکالے — پڑی ہوں میں تیرے دروازے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حالی ہندوستانی سماج کی "بیوہ" عورتوں سے کس قدر باخبر ہے اور ان کے شعور نے کس قسم کا درد محسوس کیا ہے۔ صرف یہ اگر ان اشعار کو دیکھئے تو یہ اشعار ایسے شاعر کے ہاں پیدا ہو رہے ہیں جس کی بھی غمازی کر رہے ہیں اور ہر شعر شاعر کے قریبی مشاہدے پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی بیشتر نظموں کا آپ غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو مشاہدات تجربے اور ایک مخصوص شعوری فکر کا امتزاج ملے گا۔ ان کی ہر نظم کم و بیش اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ملے گی۔ اکثر فکر و فلسفہ غالب ملیں گے۔ مگر غزل کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس میں داخلیت، وجدان اور لاشعور ہی کام کرتے پائے جاتے ہیں۔
قبل اس کے کہ میں ان قوت محرکات کا مفصل ذکر کروں میں ایک بار پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان میں اور دوسری اصناف شاعری میں کام کرنے والی قوت محرکات میں محض تناسب کا فرق ہے نوعیت کا نہیں۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد آیئے ذرا ان قوت محرکات کا تفصیلی جائزہ لیں

داخلیت

پہلے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ داخلیت سے میری مراد یہاں داخلی شخصیت ہے۔ اس لئے کہ میرے نزدیک مجرد داخلیت کوئی چیز نہیں۔ لہذا داخلیت کے استعمال کو داخلی شخصیت کے مترادف سمجھنا چاہیے۔ داخلی شخصیت اور خارجی شخصیت میں بہت کچھ فرق ہے۔ انسان کی خارجی شخصیت کو ماحول بناتا اور بگاڑتا ہے مگر داخلی شخصیت خود انسان کے ہاتھوں بنتی اور بگڑتی ہے۔ ان دونوں میں اس تعاون کے باوجود کوئی خط مستقیم نہیں کھینچا جا سکتا۔ اس لئے کہ کبھی انسان اگر اپنے ماحول کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے تو کبھی ماحول انسان کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے۔ کبھی ماحول شخصیت پیدا کرتا (یا بدلتا ہے) تو کبھی شخصیتیں ماحول پیدا کرتی (یا بدلتی) ہیں۔ البتہ ان میں سے کسی ایک کی تخلیق یا تبدیلی سے پہلے ایک کش مکش کا دور گزرتا ہے اور داخلیت و خارجیت کی یہ کش مکش ایک بڑی حد تک شعور و لاشعور کی کش مکش پیدا کر دیتی ہے۔ جس کو چھپائے چھپایا نہیں جا سکتا۔ میں یہاں ڈاکٹر اقبال کی مثال دیتا ہوں۔
ڈاکٹر اقبال کے محدود مطالعے سے میں جو کچھ اندازہ لگا سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اقبال میں شعور و لاشعور کی کش مکش اس وقت تک جاری رہی جب تک وہ اس طرح کے اشعار کہتے رہے ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

؎ میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

اقبال کا "لاشعور و شعور" ایک اچھا خاصا موضوع ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مغربی فلسفوں کی قدریں اور رومی کی فکری بنیادیں اقبال کے لاشعور میں ایک مدت خاص کے اندر کچھ اس انداز سے پیوست ہو گئیں کہ جب انہوں نے خودی کی تلاش میں اسلام کی طرف رخ کیا تو اس میں ایک گونہ تاخیر معلوم ہوتی ہے۔ خیر تو یہ ہمارا موضوع نہیں۔ بلکہ یہاں تو یہ دیکھنا ہے کہ شعور و لاشعور کی کش مکش کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں فرائڈ اور اس کے مکتبۂ فکر کے چند دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ اس کش مکش کی وجہ "جنس" ہوتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ شعور لاشعور کی کش مکش کی وجہ بہت سارے عوامل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہٹلر کی یہود دشمنی کا جذبہ جنگ اقتدار سے پہلے لاشعور کے ایک گوشے میں پڑا رہا ہے اس کے بعد جیوں جیوں وہ (ہٹلر) کامرانی کی طرف بڑھتا گیا ویسے ویسے مذکورہ جنگ میں وہ یہود دشمنی کے موقف کو اپناتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا لاشعور شعور میں تبدیل ہو گیا۔ لہذا لاشعور کو محض "جنس" کی عینک سے دیکھنا اسی قدر محدود تصور ہوگا جس طرح حالی اور اقبال سے پہلے ہمارے بیشتر شعراء عشق سے "عشق جنس" مراد لیا کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل لاشعور — بحیثیت ایک قوت محرکہ — کی ذیلی سرخی کے تحت پیش کی جاتی ہے۔ مگر اس سے پہلے وجدان کا جائزہ پیش کرتا ہوں۔

وجدان

یہاں وجدان سے میری مراد وہ اندھی قوت نہیں جو محض

تنہا دسمردد میں بیٹھ کر حق ہو کے نعرے لگایا کرتی ہے اور نہ ہی اس سے میری مراد وہ
قوت ہے جو شاعر کو تموّجِ زندگی سے دور ہٹا کر "منظرِ ساحل" میں گم کر دیتی ہے۔ بلکہ
وجدان کو میں ایک ایسی قوت یا ذہانت سمجھتا ہوں جو احساسات کی گہرائیوں میں
ڈوب کر حقائقِ زندگی کے تابندہ اور درخشندہ موتی نکالتی ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ اردو غزل کا ماضی نہ صرف یہ کہ اس قوت سے نا آشنا تھا بلکہ شاعر کی گم
گشتگی اور گنگناہٹ ہی کو وجدان کے روپ میں پیش کرتا ہے اس میں بھی
شک نہیں کہ دورِ حاضر بھی اس لحاظ سے کم مایہ ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں
کہ ایک غزل گو قوتِ وجدان حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ وہ یقیناً ایسا کر سکتا ہے۔ اور
یقیناً اس کے حصول میں تغزل کی کامیابی کا ایک بہت بڑا راز مضمر ہے۔ اس لئے
کہ وجدان کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے اور زندگی کی قدروں کی تلاش
میں صرف عقل پر بھروسہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر کی تراشیدہ آنکھوں پر اعتماد
کر لیا جائے۔ میں ڈاکٹر اقبال کے مندرجہ ذیل شعر اسی جذبے کی تحت پڑھتا ہوں

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مگر میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محض "دل پر بھروسہ کر لینا" — جیسا کہ
صوفیانہ تغزل نے کیا — کسی طرح بے پتوار کی کشتی سے کم نہیں۔

اب معاملہ محض وجدان کی نوعیت کا رہ جاتا ہے۔ اس پر اگر ہم غور کریں تو
بہ آسانی اس کا علم ہو سکتا ہے کہ اس معاملہ میں ہمیشہ افراد اور قوموں میں اختلاف
رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح جوہری کی نگینوں کی پرکھ میں! مشاہدہ بتاتا ہے کہ
کبھی انسان کی قوتِ وجدان اپنی ذاتی فکر و فلسفہ کی حد تک بڑھ کر رہ جاتی ہے۔
کبھی قوم اور ملک کے اجتماعی فکر و فلسفہ پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کائنات کے طلسم
کدوں میں گم ہو جاتی ہے۔ مگر ان کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انسانی تاریخ کی
ابتدا سے قوتِ وجدان ان حدود سے آگے بڑھ کر ان سب کے پیدا کرنے والے تک
پہنچتی رہی ہے۔ اور فی الحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اور بالخصوص غزل گو
کی قوتِ وجدان کو سیر پذیر ہونا چاہئے۔ ورنہ دوسرے مقامات اس قوت کی سیر میں
محض قریب منزلیں ہیں جن سے پیچھے ہی میں فلاح ہے۔

لاشعور

اس کے بعد آئیے ذرا لاشعور کا تجزیہ کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ غزل گو
پر اس قوت کا کتنا اثر ہوتا ہے۔ کس طرح کا اثر ہوتا ہے۔ اور کیا
ہونا چاہئے۔

فرائڈ اور دوسرے علمائے نفسیات کے نزدیک ہمارے دماغ کے تین خانے
ہیں۔ پہلا شعور، دوسرا لاشعور، تیسرا تحت شعور۔ اس میں تحت الشعور کی حیثیت
No man's land کی ہے۔ اہم رول شعور اور لاشعور ہی ادا کرتے ہیں۔
شعور کو میں نظر انداز کرتا ہوں۔ لاشعور کی طرف آتا ہوں۔ نفسیات دانوں میں
سے اکثر اس پر متفق الرائے ہیں کہ لاشعور ہماری دنیائے خواب میں طرح طرح
سے آتا ہے اس لئے کہ حالتِ بیداری میں اس پر شعور اور تحت الشعور کا بوجھ ہوتا
ہے۔ اور وہ ابھر نہیں سکتا۔ البتہ خواب کی حالت میں جب ان دونوں کی گرفت
کچھ ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو لاشعور اسٹیج پر آتا ہے۔

اب چونکہ بات غزل کے سلسلے میں ہو رہی ہے اور میں نے پچھلی سطروں
میں یہ لکھا بھی ہے کہ غزل کا تعلق شعور سے زیادہ لاشعور سے ہوتا ہے اس لئے
آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت جب لاشعور دنیائے خواب
میں ظاہر ہوتا ہے تو کیا غزل گو اپنی غزلیں دنیائے خواب ہی میں کہتے ہیں؟

اس سوال کے صحیح جواب کے لئے اگر آپ خود غزل گو ہیں تو اس پر
سوچئے کہ آپ کس طرح اور کس حالت میں غزلیں کہتے ہیں۔ اور اگر شاعر
غزل گو نہیں ہیں تو اس کا قریبی مشاہدہ کیجئے۔ میں اس سلسلہ میں نہ صرف یہ کہ
اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کو پیش کرنا چاہوں گا بلکہ میں نے دوسرے
غزل گو شعراء سے جو تاثر لیا ہے وہ بھی درج کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں آپ کے
سامنے اس ضمن میں ایک دوسری دلیل پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اگر ہم لاشعور کا گہری نظروں سے مطالعہ کریں تو ہمیں اس کا علم ہو سکتا
ہے کہ لاشعور کی اہم خصوصیت اس کی بے ربطی اور عدم تسلسل کی صورت ہے۔ اسی طرح
اگر ہم غزل کی خصوصیت معلوم کریں تو ہمیں اس کا علم ہو سکتا ہے کہ غزل کی
اہم خصوصیت بے ربطی اور عدم تسلسل ہے۔ جس کا "وہ کلیم صاحب نے کیا ہے
اس لحاظ سے لاشعور کے اظہار کے لئے اگر کوئی صنفِ ادب موزوں ترین صنف
ہو سکتی ہے۔ تو وہ غزل ہے۔ اب آئیے ذرا مشاہدات اور تجربات کی دنیا سے
حقیقت سے چند مثالیں بھی لیں۔

آپ جیسے ہی اچھے سے اچھے شاعر کو لیں آپ کو اس کی تصنیفات سے
یہ علم ہو جائے گا کہ اس نے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ اپنے فکر و فلسفہ کی
لڑی میں پرو دیا ہے اور اس نے شعوری طور پر ایک ایک لفظ رکھا ہے۔ اسی طرح
آپ جتنے اچھے سے اچھے نظم گو کو لیں آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ
اپنی نظم میں زیادہ سے زیادہ الفاظ شعوری لاتا ہے۔ بالخصوص ان کا موضوع
اور مضمونِ تخلیق سوچا سمجھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر اس کے برعکس ایک غزل گو بالعموم
مصرعہ ثانی کہنے کے بعد گنگناتا رہتا ہے۔ تاوقتیکہ مصرع اولیٰ ہاتھ لگ جائے۔
بلکہ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ مصرع ثانی نکلے چلے آتے ہیں اور مصرع اولیٰ کی

پس پشت کام کر رہا تھا۔ اسی طرح آج بھی بیخود صاحب، نوح صاحب اور اس طرح کے دوسرے شعراء کا کلام جس ڈگر پر چل رہے ہیں وہ انھیں قدما کی ہے۔ جہاں زندگی ایک بے روح صورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اس صورت کی تراش خراش بے پناہ جاذب۔ شاید حالی نے زندگی کے اس جامد اور غیر متحرک پہلو سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا ؎

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالی نے غزل کی پہنائیوں کو وسعت دی مگر داخلی شخصیت خارجی شخصیت سے مغلوب ہو گئی اور حالی کو کہنا پڑا ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اقبال نے مینائے غزل میں نئی شراب ڈھالی مگر ان میں شعور و لاشعور کی کشمکش جس کی طرف میں اشارہ بھی کر چکا ہوں عمر عزیز کے ایک طویل حصہ تک جاری رہی اس لئے بیشتر سرمایۂ غزل بھی اس سے خالی نہیں۔ پھر بھی اقبال کی قدر و قیمت ایک سنگ میل کی ہے۔ جہاں سے غزل میں نئی سمت سفر پیدا ہوتی ہے۔

(۲) اقبال کے بعد غزل گو شعراء میں ایک مقصدی گروہ نظر آتا ہے جو خود کو "ترقی پسند" کہتا ہے لوگ کبھی کبھی اس کو "اشتراکی" کہتے ہیں۔ مگر یہ اشتراکی ترقی پسند گروہ، خیر اس گروہ نے شعور و لاشعور کی کشمکش کو بھی ختم کیا۔ داخلی اور خارجی شخصیت میں بھی قدرے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس گروہ میں جتنے بھی غزل گو شعراء پائے جاتے ہیں ان کی قوت وجدان نے ایک خطرناک ٹھوکر کھائی۔ ٹھوکر اس لحاظ سے کھائی کہ زندگی کے جس نظریے کو یہ اپنی غزلوں میں سمو رہے ہیں وہ نظریۂ ایک فرد کی نجی فکر کی اپج پر جا کر ختم ہو جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ دیکھا جا رہا ہے کہ زندگی یک رخی ہو گئی ہے۔ اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں توازن نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کے برعکس "معاشی عوامل" کا عنصر ان کی زندگی کا مرکز و محور نظر آتا ہے۔ زندگی کے اسی یک رخے پن نے شعوری قوت کو محدود کر دیا ہے۔ جس کے سبب غزل کی وسعت اسی طرح معاشی عوامل کے ارد گرد محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جس طرح متاخرین کے یہاں غزل کی وسعت "وصل و رقیب" تک محدود ہو گئی تھی۔ آئیے چند مثالیں بھی دیکھ لیں ؎

کچھ کہہ چکے ہیں بانوئے محفل نشیں کو ہم
ہر کنیز آبلہ پا تم بھی کچھ کہو ([illegible])

یہ شعر مقصدیت کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں شاعر نے بڑے سلیقہ سے طبقہ واریت کو پیش کیا ہے۔ ایک نظر آپ خط کشیدہ ٹکڑوں پر ڈالیں آپ کو اس کا احساس ہوگا کہ شاعر کیا کہہ گیا ہے۔ اس شعر میں نہ صرف یہ کہ رنگِ تغزل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ شعور و لاشعور کی ہم آہنگی کی بھی یہ ایک مثال ہے، مگر بات وہی ہے کہ بنیادی طور پر جس فلسفے کو پیش کیا گیا ہے وہ قوت وجدان کی اس ٹھوکر کا نتیجہ ہے جو انسان ایک دوسرے انسان کے "روکٹ" بن جانے سے کھاتا ہے۔ مگر ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ ہو ؎

کیوں کوئی "لال کتاب" بول اٹھے
ہر قصور آپ ہمارا سمجھیں (شاد عارفی)

یہاں شاعر نے بالکل کھل کر بات کرنی چاہی ہے۔ اور طنز ہی طنز میں ایک پورے نظامِ "لال کتاب" کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی ایک مثال پہلے شعر میں ملتی ہے۔ مگر بات وہی ہے کہ انسان اپنی خود ساختہ قدروں کو اپنائے یا اس کو جس کی طرف یہ پورا نظامِ فطرت اشارہ کر رہا ہے۔ بہ الفاظ دیگر غزل گو "آستانوں" پر جبہ سائی کرے یا کسی ایک آستانہ ——— ور اس کے بے شمار ساقی ہوں یا "ایک ساقی"؟

(۳) درحقیقت یہی ایک خلش تھی جس نے ایک "فطری نظام زندگی" کے جیالے، کی طرف مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کو اکسایا۔ ان کی تاریخ جتنی گہری کا یہ کوئی مقام نہیں، نہ ہی ان کے اس "فطری نظام زندگی" پر کچھ کہنے کا یہ موقع ہے۔ بلکہ اب یہ نظام "حقیقتِ منتظر" کے بجائے "حقیقت" سرگرمِ عمل ہے۔ اور اس میں ادباء اور شعراء اپنا اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ اس بظاہر نئے انقلاب کے ماننے والے شعراء زندگی کی فطری قدروں کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں جو ماضی، حال اور مستقبل کی زنجیروں سے آزاد ہیں۔ اور غزل کا یہی مزاج بھی ہے۔ وہ اس طرح کے زمان و مکاں کی قیود، شرخ و سپید کے بندھن اور وطن دولت کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی۔ وہ تمام چھوٹے بڑے خداؤں کی خدائی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے اور پکار اٹھتی ہے ؎

یہی اک سبق دیا ہے مجھے مسلکِ فنا نے
کہ میں جان کو جاں سمجھوں جو ترا کہا نہ مانے ([illegible])

اب میں تنقید نہیں۔ اسے شعور نے کس طرح اپنے لاشعور پر قابو حاصل

بات ہے پر کھنے کی چیز ہے پھر اس وسعت اصولِ حیات کو کس طرح پیمانۂ غزل میں ڈھالتا ہے۔ یہ بھی معمولی چیز نہیں۔ حفیظ کے اس شعر کے علاوہ ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

چاہے کتنا ہی وہ محبوب تھا، کتنا ہی عزیز
تم خفا جس سے ہوئے اس سے خفا ہیں ہم بھی (حفیظ)

اس میں صرف یہ کہ شاعر نے کسی "ایک" کی اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ اس نے اس اپنائیت سے پیدا ہونے والے نتائج کو بھی اسی میں سمو دیا ہے۔ "اس کو" اپنا بنا لینے کے بعد معلوم نہیں کتنے اپنے غیر ہو جاتے ہیں اور کتنے غیر اپنوں سے بڑھ کر پھر اس میں "اس کی رضا" کا جو پہلو پایا جاتا ہے وہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ ہم ان "انقلاب نو" کے غزل خوانوں کی تخلیقات سے اس طرح کی بیشمار مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ مگر مثالوں سے صفحے پُر کرنا یہاں مقصود نہیں یہاں تو ایک خاکہ پیش کرنا ہے۔

البتہ اس "انقلاب نو" کے غزل خوانوں کی تخلیقات میں (ان کی غزلوں میں) ایک دوسری خصوصیت (اس وسعت دامانی کے علاوہ) جو پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ان کی غزل کا ہر شعر اپنے ماقبل اور مابعد کے اشعار سے روحِ نظریہ کے اعتبار سے ہم رشتہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح لیبنز Leibnitz نے اپنے نوماڈ Monads کے بارے میں کہا ہے۔ غزل میں یہ وحدتِ تاثر، فکر، اور فلسفہ، یہ تنظیم، ترتیب اور تکمیس فی الحقیقت اس روحِ نظریۂ زندگی کا فیضان ہے ——— جو نظریہ لازمی طور سے خود اپنے اندر وحدت، تنظیم، ترتیب اور قوتِ تکمیس رکھتا ہے۔ ترقی پسند ——— یا آستہ اکی غزل گو شعرا میں ——— وحدتِ تاثر تو ملتا ہے (وہ بھی کامیاب غزل گو شعرا کے یہاں) لیکن دوسری چیزیں مفقود یا نہ ہونے کے برابر اس لئے کہ زندگی کے معاشی حصے میں مارکس کا حل جیسی حقیقت میں فرائڈ کا نسخہ، عمرانی شعبہ میں کانٹ اور ڈارون وغیرہ پھر وحدت نظریہ پیدا ہو تو کیوں اور کیسے۔ اس کی توقع ایک خیالِ خام کے علاوہ اور کچھ نہیں۔
اس لئے غزل پر بے ربطی، عدمِ تنظیم، غیر مربوط ہونے کا الزام لگانا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ خود زندگی میں انتشار، اختلال، بدنظمی اور بے ربطی ہو۔ اور خود زندگی کے پاس ایسا کوئی نظریہ نہ ہو جو اس میں وحدت زندگی پیدا کر سکے، ورنہ اس پر یہ اعتراض مہمل اور بے معنی ہے۔

البتہ میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس اعتبار سے غزل تمام اصنافِ شاعری میں ایک مشکل ترین صنفِ شاعری ہے۔ اس لئے کہ غزل کہنے کے لئے غزل گو کو صرف اپنی داخلی شخصیت پر قابو ہونا چاہئے بلکہ اس ان داخلی اور خارجی شخصیت کو

حد تک

یکساں ہونا چاہئے۔ اور اگر کہیں سے بھی ہیئت خالق کے آثار نظر آئے تو شعور و لاشعور کی دوئی نمایاں ہو کر رہے گی۔ اسی طرح غزل گو کے لئے اس قوت وجدان کی ضرورت ہے جو حقیقت کی گہرائیوں میں اسے صحیح سلامت اتار سکے اور اسے باخبر واپس بھی لائے اسے اس گنگناہٹ کی ضرورت نہیں جو آرام کرسی پر دراز ہوتے ہی ذہن و فکر پر مسلط ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہ اسے اس بے خبری کی بھی ضرورت نہیں جو کہ ہوش سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

یوں ہی اسے ایک ایسے شعور کی ضرورت ہے جو اسے زندگی کی سیدھی ڈگر پر ڈال دے اور اس کی طرف اس کی رہنمائی اور رہبری کر سکے۔ اگر اس کے اندر یہ قوت نہیں تو پھر اس کا نتیجہ لازماً ناکامی ہوگا۔

اب اگر میں اپنے مافی الضمیر کو کسی حد تک ادا کر سکا ہوں تو بغیر "انقلاب نو" کے غزل خوانوں سے یہ عرض کروں گا کہ جس وقت وہ اپنی اپنی غزلوں میں ان قوت محرکات کو سمونے کی کوشش کریں گے اس وقت ممکن ہے کہ غالب "ساغر و مینا" کام دیں اس وقت انہیں اپنے کارخانۂ فکر کے تیار شدہ "شیشہ و ساغر" پیش کرنے ہیں۔ یہ مقام کم حوصلہ کا ہے اور زیادہ کٹھن بھی ہیں لیکن جہاں غالب "ساغر و مینا" کام آتے ہیں وہاں ان میں سے "پرانی شراب" کو باہر ڈھالتے ہوئے "نئی شراب" بھرنی ہوگی اور یہ کام میرے نزدیک ذرا کٹھن اور ہمت طلب ہے۔ یہ ایک دوسری بحث ہے کہ ہم "پرانے ساغر و مینا" پر کس حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں کون ہمارے تصرف کے ہیں اور کون نہیں، یہاں ان سے قطع نظر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ غزل کو وہ کون سی قوت محرکات ہیں جو غزل میں اس "انقلاب نو" کی روح پھونک سکتی ہیں۔ جسے ہم نے اپنے لئے اور عام انسانیت کے لئے یکساں طور پر فطری اور ضروری سمجھا ہے۔ میں نے ان کا تذکرہ کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہیں اور خود غزل گو حضرات کی تعداد میں ماشاء اللہ روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر معیارِ غزل چند ایک کے علاوہ ناقابلِ اطمینان ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پوری غزل پڑھ لینے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کی منزل کیا ہے البتہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

سید مستفیض الحسن، ایم۔ اے

اسلوبِ بیان

کسی ادیب کی ذہنی ترقی کا پتہ اُس کی قوتِ بیانیہ اور اسلوبِ تحریر سے چلتا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات کا صحیح تجزیہ کر کے حسبِ بیان کے [illegible] ہیں، یہ بود سکتا ہے، مبہم احساسات کو اپنی قوتِ میسرہ سے واضح شکلوں میں پیش کر سکتا ہے، اس کے الفاظ اُس کے خیالات کی کما حقہٗ ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اُس کے جذبات کی شدت یا اُس کے احساس کی نزاکت اُس کے بیان سے منعکس ہے۔ تو وہ ایک کامیاب ادیب ہے ورنہ ابھی اُس کو کثرتِ مشق کی ضرورت ہے۔ اچھے اسلوبِ تحریر سے ادیب کے ذہن کے سلجھے ہوئے اور تربیت یافتہ ہونے کا پتہ چلتا ہے اور بے ڈھنگے طرزِ بیان سے ادیب کے منتشر خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اچھا اسلوب ادیب کو نہ صرف اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں معاونت کرتا ہے بلکہ یہ بات بھی بڑی حد تک طرزِ ادا ہی پر منحصر ہے کہ ادیب اپنا نقطۂ نظر کس حد تک قاری کے ذہن نشین کرا سکا ہے۔

شعر ہو یا نظم دونوں اصنافِ ادب میں اسلوبِ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سلسلے میں کسی ایک صنف کو دوسرے پر فوقیت دینا درست نہیں، دونوں ہی اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں۔ اگر ان میں کوئی تمیز و حدِ امتیاز ہے تو وہ خالص ٹیکنیکل (Technical) ہے یعنی نظم تمام الفاظ کا ایک [illegible] ہوتی ہے۔ نثر میں [illegible] ہوتی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ ٹیکنیک بھی جس کا ذکر ہوا اسلوبِ بیان [illegible] عام ہے۔ شعر عالمِ تخیل سے تعلیق ہوتا ہے، اس لئے اس کا اسلوب [illegible] ہوتا ہے۔ نثر واقعاتی اُمور کی نگارش کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے اس کا [illegible] صاف، سادہ اور سلجھا ہوا ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ اعتبار بھی [illegible] اور یہ حد بندی بھی صحیح نہیں۔ بعض اوقات نثر بھی لطیف ہو جاتی ہے اور [illegible] شعری نزاکتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات نظم بھی اصطلاحاً تو [illegible] اس میں واقعاتی اُمور بیان کئے جاتے ہیں۔

واقعہ ہے کہ اسلوبِ بیان درحقیقت اس امر کہ ادیب نے اظہارِ خیال کے لئے [illegible] کو [illegible] ادیب کے ذہنی جھکاؤ (Inclination of [illegible]) پر منحصر ہے۔ اس کے لئے کوئی بنے تلے قوانین وضع کرنا اصولاً صحیح نہیں۔ خیال (Idea) ذریعہ خیال (Medium of Expression)

اور اسلوبِ بیان (Style) ادیب کی اپنی شخصیت کے تیئں پرتو ہوتے ہیں۔ یہ محال ہے کہ ادیب اپنی شخصیت کو اپنی ادبی تخلیق میں جھلکنے سے روک دے۔ ادیب تو کیا مورخ یا سائنس داں کے لئے بھی یہ ممکن نہیں۔ یہ کچھ ضروری سا ہے کہ ادیب کا اپنا نقطۂ نظر (شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر) اُس کی تخلیق میں رنگ آمیزی کرتا ہے، یہی بات اسلوبِ بیان کے بارے میں بھی درست ہے۔ ادیب کا نقطۂ نظر قطعی طور پر خارجی (Objective) ہونا تقریباً ناممکن ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کی خشک بحثوں میں بھی مصنف کی شخصیت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح ادب ادیب کے اپنے احساسات اور خیالات کی جلوہ کاری ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلوبِ بیان بھی ادیب کی شخصیت سے چلا پاتا ہے۔ مکمل طور پر objective ہو جانا ادیب کے بس کی بات نہیں۔

ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا اور وہ ادب جس کو اُس نے جنم دیا ہے، اُس کے زمانے کے ہزاروں ذہنوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کیونکہ ادیب کے خیالات بھی اُس کے ماحول کی پیداوار (بڑی حد تک) ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُس کا اسلوبِ بیان اُس زمانے کی لسانی تحریکوں سے اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے اسلوب کے پرکھنے کا معیار یہ ہوگا کہ عصری رجحانات کے مطابق وہ محل و مقام کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرے (Proper words in proper places) اس کا الفاظ کا تصور جس درجہ بیدار ہوگا اتنا ہی اس کا طرزِ بیان موثر، جدید اور نکھرا ہوا ہوگا۔ ادیب کن الفاظ کو پسند کرتا ہے؟ وہ کن ترکیبوں سے گریز کرتا ہے؟ اُس کے الفاظ اُس کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اُس کے مضمون کی نزاکت یا شان و شکوہ اُس کے منتخب کردہ الفاظ سے نمایاں ہے یا نہیں؟ یہ ہیں وہ معیار جو اُس کے اسٹائل پر فیصلہ کرنے میں معاون ہوں گے۔

ادیب کے ذہن میں ردو قبول کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اُس کی نگارشات کے لئے کیسا لفظی ماحول (Atmosphere) مناسب ہوگا تاکہ وہ اپنے خیالوں کو پوری رعنائیوں کے ساتھ رقم کر دے۔

یوں کی اِن کوششوں سے ہی زبانیں بنتی ہیں۔ الفاظ بنتے ہیں اور اُن کے معانی
ساتھ کچھ مخصوص باتیں منسلک ہو جاتی ہیں۔ ادیب زبان کی رُوح کو پہچانتا
ہے اور اُس کو اپنے اسلوب سے صیقل کرتا ہے تاکہ وہ بدلتے ہوئے خیالات کی
صحیح صحیح عکاسی کر سکے۔ زبانوں کی تاریخ دیکھیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان سب
ہی منازل ارتقا سے گزرتی ہے۔ کچھ الفاظ ترک کر دیئے جاتے ہیں۔ کچھ نئے نئے
الفاظ زبان میں شامل ہوتے ہیں۔ بعض دوسرے الفاظ کے مفہوم میں تبدیلیاں
ہوتی رہتی ہیں۔ نئی اصطلاحیں بنتی ہیں۔ ہر زبان ایک انتخابی مرحلہ
(Process of Electicism) سے گزرتی ہے۔ نتیجتاً اُس
کو کچھ شستہ اور سلیس بنا دیتا ہے۔ اور وہ دقیق اور مشکل مضامین کے اظہار کا
ذریعہ بننے کے لائق ہو جاتی ہے۔ رد و قبول کے اِن مراحل میں ادیب اس جستجو میں رہتا ہے
کہ وہ زیادہ سے زیادہ (Suggestive) الفاظ کو اپنائے تاکہ وہ
کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب حُسن و خوبی کے ساتھ سمو دے، تاکہ
قاری اُس کے فن پارہ کو پڑھنے سے اُکتائے بھی نہیں اور ادیب کے نقطۂ نظر اور مقصد
سے بھی متفق ہو جائے۔ اور اگر متفق نہ ہو تو کم سے کم واقفیت ہی حاصل کرے۔
ظاہر ہے کہ ادیب کا نقطۂ نظر اور اُس کا مقصد بھی اس کے اسلوب بیان پر اثر انداز
ہوتے ہیں۔ اگر ادیب کے مقاصد خفیہ ہیں یا رمزیہ یا مبہم کیونکہ ادب حقائق
ہی کی عکاسی کا نام ہے، تو اس کا اسلوب بھی ویسا ہی الجھا اور پیچیدہ ہونا ضروری ہے
وہ جس خیال کی عکاسی کر رہا ہے وہ ٹھیک ٹھیک پڑھنے والوں کو تو منتقل ہو جائے تاکہ
حق ہی کا حق ادا ہو جائے اور اُس کی تخلیق اثر، خلوص، حُسن و شگفتگی کی امانت دار
ہو جائے۔ جس کی عکاسی وہ اس فن پارہ میں کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے ادیب کو
جہاں ضروری عناصر کی جستجو کرنی پڑتی ہے وہیں اُس کو غیر ضروری مواد کو احتیاط
سے علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ عمل اُس کے اسلوب کی نفاست اور پاکیزگی کا
ضامن ہوگا۔ کسی نے ایک مرتبہ کہا تھا

The artist may be known, rather
by what he omits

گویا غیر ضروری تزئین (Surplusage) فن پارے کی نظری
جاذبیت پر بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے اور اُس کے اثر کو کم کر دیتی ہے۔ اس سے
ادب کی مقصدیت فوت ہونے لگتی ہے۔ اس لئے ادیب کی نظر ہمیشہ مقصد و
معنی پر رہنی چاہئے۔ ادیب کو اپنے مقصد کے مطابق ہی اسلوب اختیار کرنا چاہئے۔
تاکہ اُس کی تخلیق سُوکھے ہوئے اصولوں کی طرح بے جان اور بے رُوح ہو کر نہ رہ جائے۔
اُس کی افادیت ختم نہ ہو جائے۔ اسلوب بیان کی تربیت میں ادیب کے ذہن کا
سب سے بڑا کام یہی ہے تاکہ قاری کو یہ محسوس ہو کہ حقیقت کی مٹھاس اُس کے
لبوں کو چھو گئی ہے۔

ادیب کو یہ یاد رکھنا بڑا مفید ہوگا کہ کسی بات کو بہترین طریق پر ادا
کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ اُس کا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ وہ اُسی
طریق کو اختیار کرے چاہے اُسے کتنی بھی کاوش کرنی پڑے۔ اس ضمن میں مجھے
فلابرٹ (Flaubert) کا قول یاد آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا۔

"There is but one — one form,
one mode — to express what I
want to say"

جب تک اظہار مطلب کے لئے اتنی سعی نہ کی جائے کہ اُس سے بہتر طریقہ
اظہار ممکن ہی نہ ہو تب تک ادیب اسلوب کی صحیح تربیت نہیں کر سکتا۔
اس طرح اسلوب بیان کا مسئلہ مختصراً یہ ہے کہ اظہار مطلب میں
ادیب کا جو مقصد ہے وہ پہنچ پائے۔ وہ اپنے مقصد کو ذہن نشین کرانے
کے لئے مناسب صنف بیان اختیار کرے۔ موزوں اور Suggestive
الفاظ استعمال کرے۔ شگفتہ، سلیس اور چُست فقرے ہوں۔
اور جملے مربوط ہوں اور یہ مجموعہ ادیب کی حدِ بساط میں
بہترین ہو۔ تاکہ مضمون کی رُوح اور قالب متحد ہو جائیں
اور اُس کا قاری پر وہی اثر مرتب ہو جو فن کار کے ذہن پر
فن پارہ کی تخلیق کے وقت میں ہوا تھا۔

محمد اکرم

جعفری کی "ترقی پسند ادب"

تمام دنیا کی اشتراکی تحریکیں اپنے پیغمبر ثانی لینن کے ان الفاظ پر کہ جس طبقہ کو آج لوٹا جا رہا ہے وہ جب اپنے دشمنوں کے خلاف جد و جہد کرے گا تو ایسی جد و جہد میں جھوٹ، فریب اور مکر کا استعمال ناگزیر ہوگا۔" آج بھی اسی شدت سے عمل پیرا ہیں جس شدت سے وہ انقلاب روس کے قبل تھیں۔ ناممکن تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارباب حل و عقد اس مقدس ہدایت کی پیروی نہ کرتے۔ شاید اسی وجہ سے اس ادبی تحریک کے رہنماؤں نے دروغ گوئی کو حقائق بیانی پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ حتیٰ کہ جعفری جیسے سنجیدہ نقاد بھی اس کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکے۔ خصوصاً اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں تو وہ "میکیاولین ڈپلومیسی" کے اسی رنگ میں بالکل رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انجمن کی تاریخ بتاتی ہے کہ ادبی تحریک دراصل سجاد ظہیر صاحب کی ذہنی اور تحریکی سرگرمیوں کی پیداوار ہے۔ جو خود جعفری صاحب کے الفاظ میں ایک کمیونسٹ ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے لندن کے نانکنگ ریسٹوراں میں اس انجمن کی تشکیل کی اور وہیں سے انجمن کا ایک اعلان نامہ بھی شائع کیا۔ اس کے چند ہی روز بعد پیرس کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے کمیونسٹ ادیبوں نے شرکت کی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن کا پہلا جلسہ ہوا اور اس کے بعد ہی اردو ادب نے ایک نیا موڑ لیا۔ ایسا صرف اردو ادب ہی میں نہیں ہوا۔ بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ادب کی ترقی پسند انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان سب کا مقصد وجود ایک تھا اور طریقہ کار بھی ایک۔ خصوصاً ہندوستان کی انجمن تو انگریزی اخبار اسٹیٹسمین کے نامہ نگار کے بقول تھرڈ انٹرنیشنل کے ایما اور منشا سے جاری کی گئی تھی اور اس کا مقصد اشتراکیت کی تبلیغ اور کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم تھا۔ مگر سردار کو اس سے انکار ہے۔ انہوں نے اسے ایک ناپاک سازش قرار دیا ہے جو ان کے اپنے الفاظ میں قدامت پرستوں، برطانوی سامراج کے آلہ کاروں، دشمنان قوم، ملک کی پستی، زبوں حالی اور جہالت کو بدستور قائم رکھنے والوں کی طرف سے اس لئے کی گئی تھی کہ ادب کی یہ نو زائیدہ تحریک تھی لیکن اسی کتاب میں دوسرے مقامات کے اظہار شدہ خیالات کے ذریعہ انہوں نے خاموشی کی اس تہمت

کر دوست "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" کی تصدیق کرتی ہے۔ اپنے حرف اول ہی میں وہ لکھتے ہیں۔ "ان کا یعنی روسیوں کا کوئی شاعر مرزا ترسون زادہ یہاں آتا ہے۔ اور اپنی زبان میں ہندوستان پر ایک شاندار نظم لکھ جاتا ہے۔ جسے پڑھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی سیاسی سماجی اور تہذیبی جد و جہد میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ امریکہ کا ہاورڈ فاسٹ ہمارے لئے کہانیاں لکھ رہا ہے۔ حبشی موسیقار پال رابسن ہمارے لئے گیت گا رہا ہے۔ ترکی کی کسی جیل میں بیٹھا ہوا ناظم حکمت انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہونے والے کسی مہرجی کے ساتھ اظہار ہمدردی کر رہا ہے۔" مگر یہ کون لوگ ہیں۔ ہندوستان میں گرفتار ہونے والے کسی مہرجی کے ساتھ ان کی ساری ہمدردیاں کیوں ہیں۔ ان کا مقصد کیا ہے۔ اور ان کا نعرہ کیا ہے۔ مجروح سلطانپوری کے الفاظ میں (جن کی سردار نے بڑی تعریف کی ہے) وہ نعرہ یہ ہے۔

"لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی دیش ہمارا ہو کے رہے گا
روس کا کوہسار تو دیکھو دھرتی کا شرنگار تو دیکھو
ایک زمیں کیا لال افق پر ایک ستارہ ہو کے رہے گا
اور رسے حال ستار حریت راگ الاپتے ہیں
لال پھریرا اس دنیا میں لہرا دیں آؤ"

مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سطریں اسی کتاب سے لی گئی ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی اور انجمن نظریاتی اعتبار سے سو فیصدی متفق ہیں۔ مگر سردار کو اس سے انکار ہے اور وہ اس انکار کو ایک اور جھوٹ سے یوں بہلاتے ہیں۔ "انجمن میں سجاد ظہیر جیسے کمیونسٹ بھی ہیں اور عباس جیسا نہرو پرست بھی۔" یہ ممکن ہے کہ خواجہ احمد عباس پنڈت نہرو کی شخصیت سے متاثر ہوں۔ لیکن ہر وہ شخص جس نے عباس کو تھوڑا سا بھی پڑھا ہے۔ میری اس رائے سے اتفاق کرے گا کہ وہ نظریاتی اعتبار سے مکمل کمیونسٹ ہیں۔ ان کا افسانہ "کہتے ہیں جس کو عشق" (سویرا ۵۲ء) اور ان کی گفتگو "نقوش لاہور"

یہ گالی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "زید ایک فسطائی تھا کیونکہ اس نے جرمنی کے ساتھ ایسے وقت میں تعاون کیا جب نازی اس کے وطن فرانس کو غلام بنا کر فرانسیسی عوام کے خون کی ندیاں بہا رہے تھے"۔ یہاں سردار کا ایک اور جھوٹ عیاں ہوتا ہے کیونکہ اگر زید نے فرانسیسی قوم کے ساتھ واقعی غداری کی تو اسے جنگ کے اختتام کے فوراً ہی بعد کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔

اور اگر سردار کا یہ الزام مان بھی لیا جائے تو بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ان لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا کیا حق ہے جنہوں نے خود بھی وطن سے ایسی ہی غداری کی ہے اور جنگِ آزادی میں بیرونی استعماری طاقتوں کا ساتھ دیا ۔ ۱۹۴۲ء میں جب ہندوستانی جنتا خصوصاً طلباء "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کر رہے تھے تو یہی ترقی پسند فن کار عوامی طاقتوں کا ساتھ چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو رہے تھے (مثلاً فیض) یہی ہیں گاؤں گاؤں گھوم کر انگریزوں کی حمایت کا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ بات صرف ایک اندرے ژید کی نہیں بلکہ آج ہر اس دانشور کو جو کمیونسٹ سامراجیت کا آلۂ کار بننے سے انکار کرتا ہے، ہر وقت خدشہ رہتا ہے کہ موسیو ضدی کے یہ ترقی پسند "اس ضربِ المثل ملا" کے مانند جو اپنے مخالف کو فوراً ہی کفر کا فتویٰ دے دیتا ہے اسے بھی فسطائی ہونے کا فتویٰ نہ دے دیں۔ حالیہ مشہور ترقی پسند ادیب کا مرثیہ عادل رشید اور اختر حسین رائے پوری (جس وقت وہ ترقی پسند تھے) اقبال پر فسطائی ہونے کا الزام لگایا۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ ان کی بیشتر تحریریں اسلامی نظام کی تشکیلِ نو اور قرآنی دستور کو واضح کرنے میں ممد ہیں۔

قرآنی نظام ——— جو سوویٹ انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ میں "مذہبی تعالیٰ ناجائز لوٹ کھسوٹ اور جاگیرداری معاشرت میں عدم مساوات کو دائمی مسلسل طور پر حق بجانب قرار دیتا ہے"۔

اپنے حرفِ اوّل کے بعد سردار نے انجمن کا اعلان نامہ بھی شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ادیبوں کا فرض ہے کہ ادب میں سائنٹفک عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مارکسزم ترقی پسندوں کا مستقل راہ ہے۔ اس زمانے کا ایک سائنٹفک نظریہ ہے سائنٹسٹ جس کو تواتر سے نفی میں دیتے ہوئے مارکسزم کی بنیاد نیوٹن کے نظریہ عمل اور ردِ عمل پر ہے جس کی آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت کے ذریعے دھجیاں اڑا دیں ہیں... نظریہ اضافت کے شائع ہو جانے کے بعد مارکس کا جدلیاتی نظریہ مسترد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سابق کمیونسٹ رکن زید لاوٹلے کہتے ہیں جب تک روس میں ... ان کی تمام لائبریریوں میں آئن سٹائن کی کتابیں ممنوع تھیں۔

بدقسمتی سے ترقی پسندوں نے خدا اور مذہب کو عقلیت پسندی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا سمجھا۔ احتشام حسین اپنے مضمون "سجاد ظہیر بہ حیثیت ادیب" میں لکھتے ہیں "ہندوستان کی مذہب پرستی سے جھلا کر سجاد ظہیر نے یہ رائے قائم کی کہ جب تک لوگ مذہب سے بیزار نہ ہوں گے ان کے قدم ترقی کی جانب نہ اٹھ سکیں گے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل سے زیادہ جذبات سے کام لیا"۔ غرض عقیدت پرستی کے نام پر اس ادبی تحریک نے اپنی تشکیل کے فوراً ہی بعد سب سے زیادہ غیر عقلی نظریہ کو سب سے زیادہ غیر عقلی طریقہ پر (یعنی دلیل کے بجائے جذبات ابھار کر) کامیاب بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ چونکہ الحاد انجمن کے اربابِ حل و عقد کا بنیادی عقیدہ ہے اس لئے قدرتی طور پر اردو کے ادبی سرمایہ کا بڑا حصہ ان تخلیقات پر مشتمل ہے۔ جن میں خدا کا یا تو انکار کیا گیا ہے یا خدا کا مذاق اڑایا گیا ہے مثلاً سلام مچھلی شہری (جب وہ ترقی پسند تھے) کا یہ شعر

مجھے دیوتاؤں اوتاروں اور خداؤں کے قصوں سے نہ بہلاؤ
میں شاعر ہو گیا ہوں ——— اشتراکی شاعر

یا اختر الایمان کا یہ شعر

اگر سچ جانتا ہوں یہ بھی اس کی رحمت و جود و سخاوت ہے
اسی نے دی نسیم سحر کو دارائی اور نکہت مجھے بخشی
اسی نے بادہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
اسی نے ہرزہ کاروں کو تونگر کر دیا دریوزہ گر مجھ کو

اس پر ظ انصاری کا یہ نوٹ "شبلی نے تصوف کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب آدمی پر مصیبت پڑتی ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے۔ لیکن اختر الایمان کے یہاں خدا اس وجہ سے نہیں آیا بلکہ طنز کو تیکھا کرنے کے لئے تاو مطلق کا استعمال کیا گیا ہے۔" حالانکہ تمام عصری سائنسداں اب بیشتر اس بات پر کامل اتفاق رکھتے ہیں کہ کائنات کی سب سے نمایاں حقیقت ہستی باری تعالیٰ کا وجود ہے۔ مثلاً سر آرتھر کیتھ اپنی کتاب "میرا عقیدہ" "My Belief" میں لکھتے ہیں۔

yet it (human brain) perceives how well ordered all things are and how beautiful are the invent-ions of nature. Design is manifested

every where Whether you are layman or scientist we must postulate a law of universe.

اور آئن سٹائن ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

Our religious insight is the source and guide of our scientific insight

اور پروفیسر جوڈ کہتے ہیں۔

Science and religion now pointed to the same kind of universe and taught almost by different methods the same truths

اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے پاکستان سائنس کانفرنس منعقدہ ۵ فروری ۵۴ء کو خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا۔

One who does not believe in God is either half educated or not educated

سردار ایک حقیقت نگار نقاد ہیں مگر بعض ملل مارکس نے ان میں تعصب اور بیجا جانب داری پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے جوشؔ کی مدح سرائی کا ایک نیا ریکارڈ قایم کیا ہے کیونکہ ان کے الفاظ میں ان کا یعنی جوشؔ کا زاویہ نظر اس اعتبار سے بنا ہے کہ وہ مذہبی وہم پرستی کی مخالفت کا ایک حصہ ہے۔ نیازؔ فتحپوری اپنی محض عقلی غیر حقیقی اور رومانوی افسانہ نگاری کے باوجود اس لئے سراہے جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مضامین اور رسالہ نگار کے ذریعہ الحاد کی تبلیغ کی ہے اور رسالت وحی الہام پہ پھبتیاں کسی ہیں اور اس طرح ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے سے پہلے اس کے لئے زمین تیار کرنے میں مدد کی ہے۔ اقبالؔ اپنے اعلیٰ خیالات۔ اچھوتا پن اور حسن کلام کے باوجود اسلئے تنقید کئے جاتے ہیں کہ ملائیت پر ان کی عقیدہ اسلامی نظام کی تشکیل نو کا ایک حصہ ہے۔ اور ٹالسٹائی اور پریم چند کی خامی یہی ہے کہ انہوں نے معاشرہ کی اصلاح کے لئے انقلاب کے بجائے (غالباً خونیں انقلاب مراد ہے) بلند اخلاقی اور تزکیہ نفس کی تعلیم دی ہے۔

حالانکہ عصر حاضر کے تمام ماہرین عمرانیات متفق ہیں کہ افراد میں بلند اخلاقی اور ایثار کا جذبہ پیدا کئے بغیر حقیقی امن اور خوش حالی کا حصول ممکن نہیں۔ چنانچہ پروفیسر الڈوس ہکسلے لکھتے ہیں

Technological advance is rapid but without progress in charity (i e morals) technological advance is useless

ڈاکٹر الیکسس کیرل Alexis Carral اپنی کتاب "Man the Unknown" میں لکھتے ہیں۔

" Despite the marvels of scientific civilization human personality tends to dissolve Robbers enjoy prosperity in peace, gangsters are protected by politicians and respected by judges They are the heroes whom the children admire in cinema and intimate in games

اور مشہور عالم تاریخ داں آرنلڈ ٹائن بی لکھتا ہے۔

The great need of the world is rebirth of super-natural belief

سائنس کے انکشافات اور اس کے کمالات نے سردار کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں وہ سائنس سے حسن ظن رکھتے نظر آتے

اسی کتاب میں سردار نے محسوس کو جنہوں نے خود سردار صاحب کے الفاظ میں اپنی تنقیدی نگاہ سے ترقی پسند تنقید — کے راستوں کو روشن کیا ہے۔ بہت سراہا ہے۔ اور بہتیری جگہوں میں ان کے اقتباسات پیش کئے ہیں ایک اقتباس یہ ہے کہ انسانی تمدن اور اس کے تمام شعبوں کا پہلا بنیادی پتھر اقتصادیات ہے۔ اسی طرح انہوں نے مارکسٹ ادیب رالف فاکس کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔" زندگی کی تعمیر و تخریب کی ذمہ داری صرف سماجی محرکات ہی پر عائد ہوتی ہے۔"

لیکن دوسری جگہ پر سردار نے بالکل غیر شعوری طور پر اس نظریہ کی خود ہی تردید کر دی ہے۔ چنانچہ سائنس کی تعریف کرتے ہوئے انہوں ایک جرمن انقلابی لیب نٹ کا حوالہ دیا ہے جو لکھتا ہے۔" تاریخ کی تشکیل وہ تمام قوتیں ملکر کرتی ہیں جو عالم انسانیت اور عالم فطرت میں کارفرما ہیں۔"

طالسٹائی کے متعلق سردار نے انکشاف کیا ہے کہ اس کے خیالات ایشیائی نظام کے پیداوار ہیں۔ اس کے متعلق لیبن کی رائے بھی یہی ہے۔ لیکن یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ شعور ماحول کی پیداوار ہے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ طالسٹائی ماحول میں پروان چڑھا ہوا شخص اور جو خود بھی اوائل عمری میں کٹر ملحد رہ چکا ہو۔ (ملاحظہ ہو

ایک ایسے نظام کا حامی بن جائے جو ایشیائی ماحول کی پیداوار ہو۔ ایسے ماحول میں پلے ہوئے ایک کٹر ملحد کا اتنا بڑا موحد بن جانا یقیناً ایک بڑا معجزہ ہے لیکن اس کے خیالات کو ایشیائی نظام کا نتیجہ قرار دینا نظریات مدد اصل اپنے زمانے کے طریق پیدائش کی پیداوار ہیں کے فلسفہ کا کلی استیصال کر دیتا ہے۔

غرض یہ کتاب جو بقول سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کی بالکل صحیح عکاسی کرتی ہے۔ پہلے ہی مطالعہ میں ایک ایسی کھچڑی معلوم ہوتی ہے جو غیر عقلی دلائل۔ ابہام اور اصرار کے دانوں سے مرکب ہو۔ پھر بھی الزام نہ تو سردار پر دھرا جا سکتا ہے اور نہ مردار پر کیونکہ یہ باہم متضاد افکار تو دراصل ہیں اس غلط نظام زندگی کے جس کی ترویج و اشاعت کا فخر انجمن کو حاصل ہے۔

تعاون کی راہیں

اگر آپ معیار کے لئے دست تعاون بڑھائیں بمصداق قطرہ قطرہ دریا میشود۔ بہت کچھ دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ آپ اپنے کسی بھی تعاون کو حقیر نہ گردانیں۔ اس کا مجموعی اثر متین اور محسوس مرتب ہوتا ہے

۱ ـ سلم دوست اور دی استعداد اصحاب کو معیار سے متعارف کرائیے۔ آپ خود نہ رکھیں تو ہمیں ایسے پتے ارسال فرمائیں جنہیں ہم براہ راست معیار کی طرف متوجہ کریں۔

۲ ـ اپنے یہاں کے اسکول۔ لائبریریوں اور دیانت دار یوز ایجنٹوں کے پتے ارسال فرمائیے۔

۳ ـ ایسی فرموں کے پتے ارسال کیجئے جنہیں ہم اشتہار دینے کے لئے تیار کر سکیں۔

۴ ـ اہل قلم حضرات دفتر کے تقاضوں کا انتظار کے بغیر اپنی تحقیقات ارسال فرمائیں۔

۵ ـ اپنے مفید مشوروں سے بلا تامل نوازیں۔

ناظم ادارہ معیار

شاکر تسلیم

اے ساقیِ زمانہ اِس دورِ میکشی میں
اِک جام اور وہ بھی برسوں کی تشنگی میں

سر دے کے ابتدائے دل کرتی ہے پاسداری
اِک عہد کرلیا ہے ساقی سے بیخودی میں

دَر پر تو سازشیں ہوتی رہیں گی لیکن
مجھ سے نظر ملائے ہمت نہیں کسی میں

اِس ارتقائے نو کے سارے دیئے بجھا دو
ہم تیرگی کے مارے جی لیں گے تیرگی میں

صدیوں بھی جن کا بھرنا شاکر ہے سخت مشکل
وہ زخم دے گئی ہے دنیا ہنسی ہنسی میں

چندر پرکاش جوہر بجنوری

رُخ بدلنے کو ہے کیا محفلِ دوراں کوئی
بر لبِ دار پہ ہے آج غزل خواں کوئی

یہ ندا آئی طوافِ حرم و دیر کے بعد
دل سے بڑھکر ہے کہاں صاحبِ ایماں کوئی

ٹھہری ٹھہری سی یہ موجیں یہ سکوتِ دریا
پرورش پا کے اُبھرتا نہ ہو طوفاں کوئی

کھینچکر چشمِ تصور میں بہارِ گلشن
کیوں قفس ہی میں بنا لوں نہ گلستاں کوئی

جرأتِ عشق پہ ہے ناز مجھے بھی جوہر
میرے ہاتھوں سے چھڑا سکتا ہے داماں کوئی

احقر بھٹناگر ہاشمی پوری

اُسی کی ہے یہ حیات اپنی جو زخم کھا کھا کے مُسکرائے
شرار کو گُل سمجھ کے چُن لے ستم سے لطف کرم اُٹھائے
نہ جانے کب تک سیاستوں کے حسین فریبوں کی گھاٹیوں سے
یُونہی گزرتی رہے گی دُنیا حقیقتوں سے نظر بچائے
ہمارے وجدان کے اُجالے ہیں ہر بلا خیز رہ گزر میں
ہمیں ڈرانے کی کوششیں کر رہے ہیں کیوں ظلمتوں کے سائے
پکار لوں گا تمھاری اُلفت کے تازگی بخش آسروں کو
عمل کی پُر پیچ وادیوں میں کبھی اگر پاؤں ڈگمگائے
مرے خیالوں میں بجلیاں گھر رہے ہیں آ آ کے کتنے ڈھانچے
سَروں پہ فاقوں کا بار سینوں پہ آمریت کے غم اٹھائے
جواں ارادوں کی تابناکی ہی اِس اندھیرے کی جان لے گی
غلیظ دامن میں زندگی کی حقیقتوں کو جو ہے چھپائے
ہماری گم گشتگی بھی احقر جہاں کے حق میں مفید نکلی
وہیں وہیں بن گئی ہیں راہیں جدھر جدھر بھی قدم بڑھائے

مضطر مرزاپوری

آنکھ میں نورِ یقیں ہے دل میں کیفِ جستجو
تیرے جلووں کے لئے میں پھر رہا ہوں کو بکو

یہ خلوصِ یاد کی اللہ رے پاکیزگی
نام جب آتا ہے ان کا آنکھ کرتی ہے وضو

ڈوب جائیں گے ستارے شمع بھی بجھ جائے گی
آ خیالِ یار آ پڑھ لیں نمازِ آرزو

جب زباں کھولی تو پھر وہ لطف ہی جاتا رہا
آنکھوں آنکھوں میں جو مل جاتا تھا کیفِ گفتگو

ہائے یہ دل میں خیالِ خام کیونکر آ گیا
پھر وہی اپنے چمن میں ہو بہارِ رنگ و بو

باغباں خوش ہے مگر اس کو خبر شاید نہیں
فصلِ گل میں پھول کو پینا پڑا اپنا لہو

جادۂ رنگیں کا مضطر راز ہے جوشِ جنوں
اضطرابِ عشق میں ہے حسن کا ذوقِ نمو

ظفر عالمگیر

چمک چمک کے مجھے بجلیاں ڈراتی ہیں
سنبھل سنبھل کے نشیمن بنا رہا ہوں میں

قضا کے خار سے الجھی ہوئی ہے زلفِ حیات
کسی کی زلف کے خم کو بھلا رہا ہوں میں

کلی کلی کو مرا انتظار تھا کب سے
خزاں چمن سے چلی ہے کہ آ رہا ہوں میں

مذاقِ نغمہ سرائی نہ ہو سکا پابند
خزاں میں گیت بہاروں کے گا رہا ہوں میں

ستم ہے اہلِ چمن پر چمن کا یہ آئیں
کلی کلی کو بغاوت سکھا رہا ہوں میں

کبھی ہجومِ تمنا میں اشکبار رہا
تمہارے غم میں کبھی مسکرا رہا ہوں میں

سنا ہے تم مرا اوروں سے شکوہ کرتے ہو
یہ منصفی سے کہو کیا ستا رہا ہوں میں

مظہر نسیم الہ آبادی بی اے

مرے خیال میں ہرگز نہیں وہ فرزانہ
جسے نہ آتے ہوں آدابِ بزمِ جانانہ
کچھ اُن کو یورشِ رنج و الم سے خوف نہیں
گزر رہے ہیں جو دنیا سے بے نیازانہ
بس اپنے آپ ہی آنکھوں میں آ گئے آنسو
کسی کی یاد نے چھیڑا کچھ ایسا افسانہ
مجھے یقین ہے ٹھکرا دے دولتِ عشرت
تجھے نصیب جو ہو کچھ نشاطِ غم خانہ
نسیم ضبطِ محبت کا حشر کیا ہوگا؟
چھلک گیا جو کہیں اشکِ غم کا پیمانہ

رحمان خاور

کلی کلی کے لبوں پر ہیں جن کے افسانے
کہیں وہی تو نہیں ہیں تمہارے دیوانے
حیات و موت کو سب کچھ سمجھنے والوں نے
تیری نگاہ کے انداز ہی نہ پہچانے
وہیں سے خار، گلوں کے رقیب کہلائے
چلے جہاں سے بہاروں کی زلف سلجھانے
یہاں تو گرد بھی رکھتی ہے منزلوں کا بدل
جو کارواں کی ہیں باتیں وہ کارواں جانے
نگاہِ لطف سے خاور کو دیکھنے والے
تراشتا ہے زمانہ نہیں سے افسانے

اسعد گیلانی

سکون

شرر شرر شڑاق۔

پرنالہ ٹوٹا اور پانی کی دو شلشلاتی دھاریں دیوار پر پیچ و خم کھاتی فرش پر رینگنے لگیں۔ تھپ سے ایک گارے کا تودا اور نیچے آ رہا اور دھاروں نے ایک دیواری دریا کی صورت اختیار کر لی جس میں لہریں بھی تھیں اور لہروں میں پیچ و تاب بھی۔ فرش پر چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔

"جاؤ ارشد پرنالہ ٹھیک کر آؤ۔ ورنہ مکان پانی سے بھر جائے گا۔ اور دیوار کی تو خیر نہیں۔" امی نے کہا۔ ارشد نے دروازے سے سر باہر نکال کر جھانکا۔ پانی کی ایک سرد بوند اس کی کنپٹی پر پڑی۔ بس کسی نے چاقو ہی تو چبھویا جسم میں، ایک سنسنی دوڑ گئی۔ اور اس نے سر اندر کھینچ لیا۔

"امی جان۔ میں باہر نکلا اور نمونیہ ہوا۔" اس نے گھبراہٹ سے کہا۔

"کیسی بری فال منہ سے نکالتے ہو رشیدے۔ تم تو میرے شیر ہو اور پھر دوسرا کون جائے۔" اور لنگوٹ کس کر وہ پھاوڑا تلاش کرنے لگا۔

پوس ماگھ کی جھڑیاں دھیمی دھیمی برساتیں شمالی سرد ہوائیں اور پھر کسی کا پرنالہ ٹوٹ جائے   کا ٹوٹنے دبی جانے یا پھر ارشد اس مصیبت سے دوچار تھا پھاوڑا کندھے پر رکھے ایک قدم دروازے سے باہر نکالا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اسکے رونگٹے مساموں میں سوئیوں کی طرح گڑ گئے وہ جھجکا لیکن پھر دل کڑا کر کے صحن میں چھلانگ لگا ہی دی۔ وہ جیسے دریا میں تیرنے والے برف کے کسی تودے پر آ پڑا تھا۔ جو اس کے قدموں تلے سے پھسلا جا رہا تھا۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے گر گیا اور پھاوڑا دور جا پڑا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو پھر پھسلا۔ جیسے زمین اس کے نیچے تیزی سے گردش کر رہی تھی یا وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر کسی عمیق غار کی گہرائی میں گرا جا رہا تھا۔

بسم اللہ۔ امی کی آواز آئی۔ بیٹا ذرا سنبھل کر چوٹ تو نہیں آئی ابا نے تربت سے کہا۔ اور خجالت رفع کرنے کے لئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا۔ پھاوڑا چلانا دوبھر تھا جب ٹوکری گارے سے بھر گئی تو وہ اُسے کندھے پر لاد کر ایک ہاتھ میں پرنالہ اٹھائے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ سردی سے اسکی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور جسم لرز رہا تھا۔ ٹوکری منڈیر پر رکھ کر وہ چھت کا سوراخ دیکھنے کیلئے جھک گیا۔ جس میں سے پانی مکان میں ٹپک رہا تھا۔ چھت کا سارا پانی بہہ کر اسی سوراخ میں جا رہا تھا۔ بوندوں کی ٹپ ٹپ۔ تیز ہوا کی سائیں سائیں اور اس کے دانتوں کی کٹکٹاہٹ قدرت کی اس پُر سکون موسیقی میں وہ پانی کی بوچھاڑ کے اندر کھڑا سوراخ بند کر رہا تھا۔ اور اس کے ذہن میں گرم لحاف کا تصور خوشگوار لہریں پیدا کر رہا تھا۔

اچانک قریب کی چھت سے تھپ تھپ کی آواز آئی جو اسے اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ رانی تھی جس کی باریک باریک انگلیاں بڑی تیزی سے چھت کا کوئی سوراخ بند کرنے میں مصروف تھیں

"بارش خوب زوروں پر ہے رانی۔"

اور جواب میں اس نے صرف ایک سسکی سنی۔

"کیا کوئی سوراخ بند کر رہی ہو۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

جواب میں پھر ایک سسکی کی آواز آئی۔

"کیا مکان میں پانی بہت جمع ہو گیا ہے؟" اس نے رانی کے قریب جا کر کہا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں نے خالہ جان سے کہا بھی کہ میرے پاؤں میں درد ہے۔ لیکن انہوں نے زبردستی بارش میں اوپر بھیجا۔ منو بھی تو پاس بیٹھا تھا اسے نہ کہا کہنے لگیں تمہارے پھول تھوڑے ہی جھڑ جائیں گے۔ سوتیلی جو ہوئیں۔ میری امی ہوتی تو کیوں بھیجتی۔" وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔

ارشد سوچنے لگا۔ یہ سوتیلا پن بھی کتنی بڑی لعنت ہے۔ وہ بھی اس کام کے لئے چھت پر آیا تھا۔ اور رانی بھی۔ وہی الفاظ اسے کہے گئے تھے جو رانی کو۔ بلکہ اسکو کہنی میں تو اب تک چوٹ کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور خراش والی جگہ پر تو سرد ہوا کا ہر جھونکا سینکڑوں سوئیاں چبھوتا ہوا

گزر جاتا تھا لیکن فرق صرف کہنے والوں میں تھا ماں کے الفاظ شربیا اور سوتیلی کے وہی الفاظ بغض، عداوت کا نشان بن جاتے تھے۔

اچانک کھٹ سے اس کی ٹھوڑی پر کوئی کنکر آ پڑا۔ پھر کر اس نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نہ تھا۔ صرف [illegible] برف کے سے سفید دانے برس رہے تھے اور رانی بھیگے ہوئے کپڑوں میں لپٹی لپٹائی گٹھڑی سی بنی سردی سے کانپ رہی تھی۔

"رانی تم نیچے جاؤ۔ تم سے یہ بڑا سوراخ بند نہ ہوگا۔ اس سے تو پھاوڑے اور زیادہ گارے کی ضرورت ہے میں۔ [illegible]

"وہ جھجکی ..." "ہاں ہاں جاؤ۔ میں کہہ رہا ہوں" ارشد نے [illegible] کہا اور وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے مکان کے صحن میں اتر گئی۔

وہ جھجک کر اپنی چھت کا سوراخ بند کرنے لگا۔ ایک بڑا سا اولا اس کی ریڑھ کی ہڈی پر آ کر لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بارش کے ٹھنڈے قطروں میں دو گرم گرم قطرے مل گئے۔ [illegible] دی کے دوسرے اور گرمی کے مہشت کے درمیان وہ معلق تھا۔

"ارشد بابو اب تک نہیں آئے" اماں کی آواز نیچے سے آئی۔

اچانک جیسے وہ تخت سے جوہڑ میں کود پڑا ہو۔

"ساری چھت کے پانی کا بہاؤ اس طرف ہے۔ بند کر رہا ہوں ابا جی" ارشد نے لپک کر کہا۔

اور پھر اس نے پرنالہ لگا کر گارے سے اسے اچھی طرح جما دیا۔

"کہاں بھاگی آ رہی ہے ڈائن۔ ابھی تو پانی دھڑا دھڑ آ رہا ہے"

رانی کا استقبال ایک کرخت آواز سے ہوا۔ اور دوسرے لمحہ ارشد اور رانی چھت پر کھڑے تیزی سے ایک بڑا سوراخ بند کر رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کسی مظلوم اور بیکس انسان کو سائبیریا کے برفستانوں میں سردی سے دم توڑتے ہوئے لحاف اڑھا دیا ہے۔

اور جب وہ [illegible] بند کر چکا۔ تو اس نے بارش کی بوچھاڑ میں مکان کی چھت پر [illegible] ہو کر چاروں طرف دیکھا۔

دور دور تک درخت بارش میں نہائے ہوئے عجیب چپ چاپ کھڑے تھے۔ [illegible] ابا کا گھر بہا چلا جا رہا تھا۔ مکانوں کی چھتوں پر پانی کی چادریں پھیلی ہوئی تھیں اور آسمان سے بوندوں کی مسلسل قطاریں چاندی کی کڑیوں کی طرح معلق نظر آتی تھیں۔ قدرت کا ایک انوکھا منظر یہاں سے وہاں تک پوری فضا میں پھیلا ہوا تھا اور ارشد ایک عالم کیف میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس منظر میں کھویا ہوا کھڑا رہا۔

ابن فرید

چند تصویرِ بتاں

انسان خود اپنی شکل اُس آئینہ میں دیکھنے کی پروا نہیں کرتا جس میں وہ دوسروں کی شکل دیکھتا ہے۔

(۱)

پہلا رُخ

جب میں احمد بھائی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ غصہ سے کانپ رہے تھے۔ ان کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ اور وہ نیفو کو سخت سست کہہ رہے تھے۔ اور نیفو مسکین صورت بنائے کھڑا تھا۔ وہ ان کی طرف تک رہا تھا جیسے وہ ... شق ہو جائے گی۔ اور وہ اس میں سما جائے گا۔ میں بے حد متردد ہو گیا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ احمد بھائی نے طیش کے عالم ہی میں میری طرف دیکھا۔ "کیوں احمد بھائی؟" اور احمد بھائی ایک دم پھٹ پڑے۔

"ہو آ گیا۔ دیکھتے ہو اس کی ذلیل حرکت! ذرا سی کام چوری کی خاطر جھوٹ بول گیا۔ درزی کی دوکان بند ہے۔ حالانکہ میں ابھی دیکھتا چلا آ رہا ہوں اس کی دوکان کھلی ہوئی ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ واقعی غلطی نیفو ہی کی تھی۔

دوسرا رُخ

نیفو درزی کے پاس جا چکا تھا۔ میں احمد بھائی کے پاس ہی بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ احمد بھائی نے فون اٹھا لیا۔

"ہلو ------ راشد؟ ------- اخاہ اسلام علیکم۔ کہو بھئی کیا حالت ہے؟ ---- علالت سے ملنا ہوگا؟ ------ کیوں؟ ---- ---- اچھا ملاقات کے لئے ---- ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن بھئی اس وقت تو مجبوری ہے۔ مزاج اس قدر ضعف ... ہو رہا ہے کہ کمرے سے باہر بھی نکلا نہیں جاتا۔ اس وقت تو معاف کر دو۔ پھر کسی دن۔ کسی وقت۔"

احمد بھائی نے فون رکھ دیا۔

"احمد بھائی خیر تو ہے کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"اچھا ہی ہوں۔" اتنے میں نیفو درزی کے یہاں سے سوٹ لے کر آ گیا۔ احمد بھائی کپڑے بدلنے چلے گئے جب واپس آئے تو کہیں جانے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔

"کہاں جا رہے ہیں احمد بھائی؟"

"ذرا کلب۔" اور میں سوچنے لگا۔ کیا وہ دوسرے نیفو نہیں؟

(۲)

پہلا رُخ

ان دنوں دفتر میں بڑی مصروفیت تھی جب گھر سے خبر آئی کہ خالو صاحب آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اس قدر اشتیاق تھا کہ میں مصروفیت کے باوجود چند دنوں کی چھٹی لے کر ملنے چلا گیا۔ ابھی مجھے آئے ہوئے بھی ایک دن نہ گزرا تھا کہ خالو صاحب بیمار پڑ گئے اور وہ تین دنوں کے اندر ہی اندر انھوں نے آخری رختِ سفر باندھا۔ مجبوراً مجھے رخصت بڑھانی پڑی۔ میں نے افسر کو تار دیدیا۔ اور پریشاں سا بستر پر پڑا رہا۔ گھر کے تمام افراد پر افسردگی چھائی ہوئی تھی جیسے پورا ماحول نوحہ کناں تھا۔

یوں ہی ... دن گزر گئے۔ تیسرے دن میرے نام سرکاری رجسٹری آئی۔ افسر نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تھی۔ اور کارروائی کی دھمکی دی تھی۔ پریشانیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ میں فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ افسر کے پاس گیا صورت حال سمجھائی مگر وہ اپنی جگہ اڑا رہا۔ بڑا لمبا چوڑا لیکچر فرائض کی اہمیت پر دے ڈالا۔ اور نہ معلوم کیا کیا۔ میرے تمام عذر اس کے نزدیک معمولی تھے۔ اور دراصل اس کی نگاہ میں ماں باپ کی موت پر ہی تو قیمت رکھتے تھے۔

دوسرا رُخ

اتنی ہمہ اور سی مصروفیت کے دوران افسر کے ایک دور کے

رشتہ دار کا انتقال ہوگیا۔ اُس نے فوراً چھٹی لی۔ اور کام کو بے ترتیب چھوڑ کر چلا گیا۔ میں حیران تھا۔۔۔۔۔ کیا وہ اپنا اس دن کا لمبا چوڑا لیکچر بھول گیا یا انسان خود اپنی شکل اُس آئینہ میں دیکھنے کی پرواہ نہیں کرتا جس میں وہ دوسروں کی شکل دیکھتا ہے۔

(۳)

پہلا رُخ

جب انسان کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دہی کا تصور اپنے دل میں رکھتا ہے تو اس کی اپنی معمولی سی معمولی لغزش اس کو بے انتہا مضطرب کئے رکھتی ہے۔ اور وہ اپنے کئے پر کافی پچھتاوا محسوس کیا کرتا ہے۔

مجھ سے بھی ایسی ہی چند ایک لغزشیں ہوگئیں اور میرے نگراں نے مجھ کو تنبیہ کی۔ آپ آخر اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ اور یہ تصور کرکے میں لرز اٹھا۔

دوسرا رُخ

ابھی یہ رحم تازہ تھا۔ کہ میں نے اپنے نگراں کو انھیں لغزشوں میں متعدد بار دانستہ گرفتار پایا۔

اور میں ایک بار پھر لرز اُٹھا۔۔۔۔۔ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے؟

(۴)

پہلا رُخ

بڑی بیگم کا یہ طریقہ تھا۔ کہ ذرا سی چیز کے ضائع ہو جانے پر بھی وہ بے انتہا ناراض ہوتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہی ذرا ذرا سی چیزیں مل کر بہت بڑی مقدار بنا دیتی ہیں۔ بہرحال ان کا کہنا بھی کیا غلط تھا۔

اُس دن بھی جب آٹا تولتے ہوئے گلاس سے ایک چٹکی آٹا گر گیا تو وہ بہت ہی خفا ہوئیں۔ اور بڑی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ یہ اُن کے نزدیک بیوہڑپن تھا۔

دوسرا رُخ

مگر میں نے اکثر دیکھا کہ اُن کے یہاں تمام برقی قمقمے اکثر سُورج نکلے تک روشن رہا کرتے تھے۔ ایک دن یونہی میں نے ان سے سوال کر دیا۔

بڑی بیگم۔ بجلی کا بل آپ کے یہاں مہینے میں کتنے کا آتا ہوگا؟

"بھیا وہ تو مالک مکان ہی ادا کرتا ہوگا۔ ہم تو کرایہ ہی کرایہ دیتے ہیں۔"

ٹھیک ہے جب بجلی مفت ہے تو پھر کیوں بڑی بیگم اس پر اسیا اصول

چسپاں کریں۔

(۵)

پہلا رُخ

"بھیا تم نے تو بچوں کے بارے میں بہت کچھ لکھ ڈالا ہے۔ ذرا اپنے اس بھانجے کی بھی سدھار کی کوئی سبیل بتاؤ۔"

اُس دور کی عزیز بہن نے کہا۔ اور اس کیلئے ناشتہ تیار کرنے چلی گئیں۔

دوسرا رُخ

وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ پڑوسن کا لڑکا بہن کے پاس آیا۔

"چچی دو انڈے دے دیجئے۔ پھر واپس ہو جائیں گے۔"

"بچے انڈے تو ہیں ہی نہیں۔ کئی دنوں سے مرغیوں نے دیئے ہی نہیں۔"

لڑکا واپس چلا گیا۔ اور بہن نے ناشتہ اس کے سامنے لاکر رکھ دیا۔

ایک پلیٹ میں انڈے کا حاگینہ بھی تھا وہ چونک پڑا۔

"آپ نے تو لڑکے سے کہا تھا۔ کہ انڈے ہیں ہی نہیں۔"

"ارے وہ تو میں نے یونہی کہدیا تھا۔"

اور وہ پھر سوچنے لگا کہ اس کی تربیت سے زیادہ مؤثر تربیت دار پہلے سے ہی ہو رہی ہے۔

(۶)

پہلا رُخ

"بھائی صاحب ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کاش دنیا ایک بار پھر ایک آدمی سے بھر جائے تو۔ سارے دُکھ دور ہو جائیں۔"

میرے جوان فرزند نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

دوسرا رُخ

اس ! ۔ ایک نوجوان شخص نے اس کی ہتھیلی پر چار روپے رکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی میں نے ایک کا نوٹ دیا تھا۔ پانچ کا نہیں۔"

میرے جوان فرزند نے مسکراتے ہوئے نوٹ رکھ لئے اور بڑبڑا کہا "بے وقوف اگر یہ کر چلا بھی جاتا تو کس کو پتہ چلتا۔ اچھی خاصی ملاتی رقم کھو دی۔"

(۷)

پہلا رُخ

عشرت کے چہرے پر ہم نے گھر میں کبھی بھی بشاشت نہ دیکھی۔ جب

وہ ابا یا امی کے سامنے آئے تو شکوہ سنج ہے ...... آج یہ نہیں ہے کل وہ نہیں ہے فلاں سوٹ خراب ہے۔ فلاں کپڑا بہت پرانا ہوگیا۔ فلاں نے اتنا اچھا جوتا خریدا ہے۔ میرے پاس اس سے کمتر بھی نہیں۔ اس کی گھڑی بڑی خوبصورت ہے۔ ہمیں کوئی کیوں لے دینے لگا۔ غرض وہ دنیا جہاں سے اپنا موازنہ کرتے رہتے۔ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کیلئے سب کا جینا اجیرن کئے رہتے۔

دوسرا رُخ

ایک دن میں نے مراق؟ اُس سے کہدیا "عشرت تم نعمت کو جانتے ہو؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، وہ تو میرا کلاس فیلو ہے"

"دیکھو وہ پڑھنے میں کتنا تیز ہے۔ اور اخلاق کا تو اتنا اچھا ہے کہ سب ہی اُس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور تم ......؟"

"لیکن دنیا میں، اور دوسرے بھی تو ہیں۔ جو مجھ سے بھی بڑے ہیں"

اس سے قبل کہ میں جملہ پورا کروں عشرت بول اُٹھے۔

"لیکن عشرت پھر بھی۔ تم دوسرے معاملات میں کیوں نہیں سوچتے"

"اونہہ عجیب منطق ہے آپ کی؟"

اور میں غور کر رہا تھا کہ منطق حقیقتاً کس کی عجیب ہے؟

(۸)

پہلا رُخ

جمعدار نے انگوچھا لیکر ماتھے سے ہوا جھلتے ہوئے کہا۔ اُف۔ بڑی تیز دھوپ ہے"۔ اور ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا ہوکر سستانے لگا۔

دوسرا رُخ

دو ایک پیڑوں کے نیچے چند مزدور سایہ میں بیٹھ گئے تھے۔

"کیوں حرام خورو! ...... اتنی سی دھوپ تم سے برداشت نہیں ہوتی؟" جمعدار غرّایا۔

(۹)

پہلا رُخ

سیٹھ جی کے یہاں بیماری کا سلسلہ جاری ہی رہتا تھا۔ وہ روزہی کوئی نہ کوئی دوا لینے آجاتے تھے۔ جب ایک عرصہ تک میں نے یہی حال دیکھا تو مجھے ان کے گھر والوں کی طرف سے بڑی فکر ہوگئی۔

دوسرا رُخ

"سیٹھ جی بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ اپنے گھر والوں کو میسلن کے ایک ایک انجکشن لگوا دیجئے" میں نے کہا۔

"تو پھر لیتے چلئے لگا دیجئے"

"لیکن وہ تو آپ کو بازار سے خریدنے ہوں گے؟"

سیٹھ جی اچھا کہہ کر چلے گئے۔ اور پھر کبھی نہ آئے۔

(۱۰)

پہلا رُخ

صاحب میں یہ کیسے مان لوں کہ آپ کے اسلام نے غلاموں کی آزادی کی ابتدا کی، میں تو دیکھتا ہوں کہ کتنے ہی مسلمان امراء کے پاس متعدد غلام ہوا کرتے تھے"

دوسرا رُخ

اسی اثنا میں اُن کا چپراسی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جھک کر زمین بوس سلام کیا۔

(۱۱)

پہلا رُخ

حاجی شفیع جانماز پر بیٹھے ہوئے تسبیح کے دانے گھما رہے تھے۔ اور مسکرا رہے تھے۔ اتنے میں سلیمہ نے چاء لاکر اُن کے سامنے رکھدی۔

دوسرا رُخ

حاجی شفیع نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا: میری بیٹی تو ابھی سے بزرگ بن بیٹھی ہے"

سلیمہ نے اُن کی طرف، اس طرح دیکھا۔ جیسے وہ کچھ نہ سمجھی ہو۔

"کسی میں دینداری۔ بڑھاپا نہیں تو کیا ہے"؟ حاجی شفیع اب بھی مسکرا رہے تھے۔ اور سلیمہ کے ذہن میں دین کے اس تصور پر سوچ کر چنگاریاں سی چھوٹ رہی ہیں۔

(۱۲)

پہلا رُخ

پیچھے سے تیز ہارن کی آواز آئی۔ اور میں چونک پڑا۔

"نالائق موٹر کیا چلاتے ہیں سمجھتے ہیں سڑک ان کے باپ کی ہے"۔ میں نے مڑ کر دیکھا ـــــ اوہ یہ تو خالد تھا۔ اس نے موٹر روک لی "کہئے کہاں جارہے ہیں؟" خالد نے مجھ سے سوال کیا۔

"گھر ہی جارہا تھا"

"تو آیئے بیٹھئے میں ادھر ہی سے گزروں گا"

میں موٹر میں بیٹھ گیا۔ اور موٹر چل دی۔

دوسرا رُخ

خالد کے کئی بار ہارن بجانے کے باوجود ایک بڈھا سڑک نہیں چھوڑ رہا تھا۔

"نالائق سڑک پر چلنے کیا ہیں سمجھتے ہیں۔ باوا کا صحن ہے"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔

(۱۳)

پہلا رُخ

میں نے ایک مسودہ اپنے دوست کو دکھایا۔ اور انھوں نے متعدد جگہ پر

میری خامیوں کی نشاندہی کی۔

میں نے مسودہ انکے پاس چھوڑ دیا تاکہ وہ حسب منشا اس میں ترمیم کر دیں۔

دوسرا رُخ

لیکن پھر مہینوں میں ان سے تقاضے کرتا رہا۔ اور اُن کو اتنا وقت نہ ملا۔

کہ وہ مسودہ میں تحریف و ترمیم کر سکیں۔

بالآخر مجھے یہ باور کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کہ انسان ہر چیز میں عیب نکال سکتا ہے۔ لیکن اصلاح شاذ و نادر ہی کر سکتا ہے۔

(۱۴)

پہلا رُخ

"آہاہ ... السلام علیکم۔ آپ تو عید کا چاند ہو گئے، کہیئے کہاں غائب رہے۔" اور بڑی دیر تک دونوں میں محبت و شیفتگی کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ پھر آنے والا شخص واپس چلا گیا۔

دوسرا رُخ

اور استقبال کرنے والے نے کہا۔

"نامعقول کہیں کا۔ تمام وقت برباد کرا کے چلا گیا۔"

افسانہ

؟

تجمی، بی اے

صبح سہانی تھی۔ صبح اُداس تھی!

رات بھر ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی کالی گھٹائیں غائب ہونے لگیں۔ اور سورج کی ننھی شعاعوں نے جب لجاتے شرماتے، اٹھکیلیاں کرتے اور ایک دوسرے کو خوشی خوشی آگے بڑھاتے اس وسیع کائنات کو منور کرنا چاہا تو انہیں درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہوئی۔ ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا۔ نسیم سحری سے لے کر طائرانِ خوش الحان تک اور انسانوں سے لیکر حیوان تک سب ہی ایک لمحہ کیلئے سرشار نظر آنے لگے۔

جاڑوں کی بارش عموماً خوشگوار نہیں ہوتی مگر۔ جانے آج صبح سورج کی اسیلی کرنوں نے کون سا جادو کر دیا تھا کہ موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ سردیوں میں ملی ہوئی سرد ہوائیں حدت دھنوں تک کو نکھارے دے رہی تھی۔

غرضیکہ موسم بہت ہی پیارا تھا صبح بہت ہی سہانی تھی ——— مگر ——— صبح اداس بھی تھی، اداس وغمگین۔ اور صبح کی اسی غمگینی کا کسی اور کو احساس ہوا کہ نہیں۔ ہاشمی کو شدید احساس ہو رہا تھا۔

انسانی ذہن یکساں نہیں ہوتا ایک ہی چیز کے مختلف ذہنوں پر مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور یہ اثر اس کے اس وقت کے مخصوص ذہنی حالت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ ذہنی حالت عموماً اس کے ماحول، اس کی آس پاس کی دنیا کا عطیہ ہوتی ہے۔

ہاشمی ذہین تھا۔ حساس تھا۔ صاحب شعور تھا۔ مگر غیر منصفانہ بنیادوں پر تعمیر ہوئے معاشرے نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا ——— وہ سب کچھ جو ایک انسان کو کسی حیوان سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کا ذہن ایک ایسی چنگاری بن چکا تھا جس پر راکھ کی تہہ جم چکی ہو۔ اس کا شعور کبھی تو اونگھنے لگتا اور کبھی یکا یک جاگ پڑتا ——— تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد مسلسل بیکاری نے اسے پریشان کر ڈالا تھا۔ در در کی ٹھوکریں اور دولت خانوں کے چکر اس کے جسم کے ساتھ اس کے ذہن کو بھی تھکا دیتے تھے۔ ایسی حالتوں میں مخلص ہستیوں کی ڈھارس ہمت نے تیار کیا تھا ورنہ اس کا ساتھ نہ دیتا تو وہ اب تک نہ جانے کتنے عمیق غاروں میں چلا گیا ہوتا۔ اس کی زندگی کو بس ایک ہی طرح سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹی سے ٹھوکر مار کر گرایا ہوا ایک پتھر جو لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے اگر کوئی بڑا پتھر اسے روک نہ دے ——— بڑی بڑی ہستیوں نے اسے اس کے اعلیٰ مقام سے ۔۔ انسانیت سے ۔۔۔ متعدد بار ٹھوکر مار کر گرانے کی اور ایسی جگہ پہنچانے کی کوشش کی تھی جہاں انسان حیوانیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ جہاں نیک و بد کی تمیز مٹ جاتی ہے جو بھی اس کے غم کا بظاہر مداوا کرتا نظر آتا ہے اسی کے ساتھ ہو لیتا ہے ——— مگر اس کے ساتھ تو ایک ایسی قوت تھی جسے لوگ ضمیر کہتے ہیں۔ ایسے نازک مواقع پر وہ پوشیدہ قوت انگڑائیاں لیکر جاگ جاتی اور ہاشمی کو اس کی ادائیں پسند آ جاتیں۔ اور بلندیوں سے ٹھوکر مار کر پھینکے ہوئے پتھر کو سہارے کے لئے ایک بڑا پتھر مل جاتا۔

لیکن کب تک اس طرح زندگی گزاری جا سکتی ہے ۔۔۔ ۔۔؟؟ یہ سوال اسے اکثر ستایا کرتا تھا۔ آخر کب تک، کیسے، اور کیوں ؟؟ اور یہ آخری مرحلہ آتے ہی اس کے دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگتیں اور ذہن پر عجیب سا دباؤ محسوس ہونے لگتا اتنا زیادہ کہ گویا اب اس کے پرخچے اڑ جائیں گے مگر ایک، پھر وہی طاقت سرگوشی کے انداز میں کچھ کہتی ——— اور غبارے سے دھند ہوا نکل جاتی، وہ پھٹنے سے بچ جاتا ———

ایسے موقعوں پر اس کا ذہن ایک اور پلٹا کھاتا کہ نئی سنجیدگی سے وہ سوچنے میں منہمک ہو جاتا۔ یہ معاشی ناہمواریاں کیوں ہیں؟ کیا یہ ایسی ہی رہیں گی؟ ہمیں ایسی ہی حالت میں رہنا چاہئے؟ نہیں ہرگز نہیں "یہ سرمایہ دارانہ نظام" وہ اور سوچنے لگتا۔ "اس میں انسان مر جاتا ہے۔ انسانیت سسکتی رہ جاتی ہے۔ اور انسان پھر بھی کچھ نہیں پاتا" ——— اس کا کبھی کا مطالعہ کیا عاشق ذہن کچھ اور پردے اٹھانے لگتا ——— "سرخ نظام، عوامی نظام، ترقی کرتا ہوا نظام"۔ وہ سوچنے لگتا ——— اس میں پیٹ تو شاید بھر دیا جاتا ہے مگر ——— مگر انسان سے وہ سب کچھ لے کر جو اس کی حیات کا جوہر ہیں ——— وہ مشین بن جاتا ہے اور مشینیں کی مشین ہی رہتی ہے۔ پھر اس میں بھی عدم مساوات ہی رہی۔ کم از کم آدمیت اور مادیت کے درمیان اگر ایک سٹالن اور ایک معمولی مزدور کے درمیان

ہی ــــ تو ــــ پھر ــــ پھر ــــ اور یہاں اس کا ذہن ایک لمحہ کے لئے الجھا جاتا ــــ اور معاً اس کے تخیل کی آنکھیں دور بہت دور افق کے پار ایک حسین و دلربا شکل دیکھتیں۔ مبہم مبہم خد و خال نمایاں نہ ہونے پر بھی وہ انتہائی دلکش لگتی۔ ایسا حسن جسے وجدان محسوس تو کر سکتا ہے مگر دماغ اس کی عکاسی نہیں کر سکتا۔ پھر ایسا لگتا کہ وہ چہرہ مغموم ہے بے حد مغموم، شاید اس لئے کہ اس سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ کسی کو اس سے محبت نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی احساس ہوتا کہ وہ محو رقص ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے تصور کے کان سن لیتے۔ اور تب بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ اس سے پیار کرے۔ ایک پاکیزہ محبت جو ایک راہی کو اپنی منزل سے ہوتی ہے یا جو ایک مخلص داعی کو اپنے نصب العین سے ہو۔ اور وہ تلملا اٹھتا اپنی بے سر و سامانی، اپنے بازوؤں کی ناتوانی پر، اپنے دل و دماغ کی کمزوری پر اور عزم و ارادہ کی پستیوں پر ــــ اس کے ذہن میں آتش فشاں سا پھٹ پڑتا۔ اس کا جی چاہتا کہ خیالات کو فنا کر دے ان طاقتوں کو کچل ڈالے جنہوں نے اس کے محبوب کو بلکہ ذی شعور کی عزیز ترین شے کو اس طرح مجروح کر رکھا ہے۔

یکایک اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے ایک خیال ابھرتا۔ وہ تو تمہارا تصور ہے دنیا ہمیشہ سے یونہی ایسی رہی ہے۔ تمہاری منزل تمہارا خیال خام ہے۔ خیال است و محال است و جنوں۔ اور وہ تذبذب میں پڑ جاتا۔ پھر جھجکتے سے پھر سرگوشی کرتا۔ مطالعہ کرو، مدد لو، تصور کرو ــــ اور پھر اس کا محدود مطالعہ اور تصور فوراً مدد کو آ جاتے۔ اور تب صدیوں کے طویل پردے سرکنے لگتے، ایک، دو، دس بارہ۔ اور اس کی تصور کی دور بین نگاہیں کچھ اور بھی دیکھتیں۔ اور دلکشی رہتیں۔ اچانک دور افق پار وہی محبوب نظر آتا خوشحال و مسرور ــــ نورانی چادروں میں لپٹا لپٹایا، بلندیوں کی سمت کی طرف مائل پرواز ــــ اس وقت سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔ فضا میں ترنم تھا کہ رعنائی دیتی ــــ اس وقت محبت لینے والا بھی کوئی نہیں ملتا تھا۔ مطالعہ ایک جملہ پیش کرتا۔

"زمانہ میں وہ دور آکر رہے گا" وہ چیخ پڑتا ایک بار، دو بار اور نہ معلوم کتنی بار یہاں تک کہ اس کا گلا رندھ جاتا، اعصاب شل ہو جاتے اور وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑ جاتا۔

مسلسل تلاش معاش اور اس میں ناکامی کا اثر شدید ہونا ہی چاہئے ایسے حالات میں انسان کافی حد تک بہک جاتا ہے گوناگوں تخیلات جانے کہاں کہاں اور کیسے نشیب و فراز سے لے جاتے ہیں۔ رد عمل وہ بھی متاثر ناکام ہوں تو بہت ہی سخت ہوتا ہے۔ اس کی بغاوت البتہ اس کے تخیلات ہی تک محدود رہی۔ انتقام محض اس کا مقصود نہیں تھا۔ ایک خرابی کا دوسرے سے بدل جانا اس کے نزدیک مہمل تھا۔ وہ ایک ایسا نظام چاہتا تھا جس میں مساوات فکر و عمل ہو اور جس کو پرکھا بھی جا چکا ہو۔ اس کے اندر ایک انسان تھا۔ مگر یہ دنیا۔ یہاں ایک غیر انسان کے لئے تو سب کچھ تھا مگر انسان کیلئے کچھ بھی نہیں۔

اور یہی ہوا ــــ

جب تک گھر کا اثاثہ بیچ کر کام چل سکا چلتا رہا۔ مگر کب تک؟ آخر ایک دن وہ بھی ختم تھا۔ اور اب وہ تھا اور اس کی ساتھی موہوم سی امیدیں اور بھوک اور دراصل یہی ایک آزمائش کا مرحلہ تھا۔ اس کے شعور کی۔ خودی کی اور سب ہی اعلیٰ صلاحیتوں کی آزمائش تھی۔ "سخت مقام" آ گئے تھے۔ یا تو دوسرے انسان نما حیوانوں میں شامل ہو جاتا تھا یا پھر بصورت دیگر اس کی شخصیت مثل کندن کے ہو جاتی۔

اور اس دن شام کو تھکے ماندے آکر جب وہ ملگجے بستر پر گر پڑا تو اسے کھانا کھائے تین دن ہو چکے تھے ــــ تین طویل دن تین طویل راتیں ــــ اور پھر رات کو ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی۔ مگر سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی گھٹائیں بھی غائب ہونے لگیں۔ اور دن کے رات کی مینا میں ستاروں فطرت کی فیاضی کا ثبوت دینے لگیں۔ موسم بہت دلآویز تھا۔ صبح سہانی تھی مگر، پانی کا حساس دل اداس تھا۔ سارا زمانہ اداس تھا۔ ساری کائنات ہی تصویر یاس تھی۔ اور وہ صبح بھی اداس تھی۔ اداس و غمگین۔

اس نے کائنات پر ایک نظر ڈالی۔ اسے بھی ایک طرح کا کیف سا حاصل ہوا۔ مگر دوسرے خدمات نے کسی اور چیز کا موقع ہی نہ دیا۔ فطرت کی فراخ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ پھر نکل پڑا۔ "شاید کوئی دوست ہی مل جائے اور کچھ کھلا دے" اس خیال کے آتے ہی ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ کر رہ گئی۔ "وہ کتنا گر گیا تھا" اس نے سوچا۔ اور پھر ایک دوست کے گھر کی جانب چل پڑا۔ ایک ٹیوشن کی امید تھی۔ شاید مل جاتا ــــ وہ چلتا رہا سوچتا، بڑھتی ہوئی بھوک، رکتا۔ لڑکھڑاتا، ٹھہرتا۔ اور چلتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا کلیجہ چبائے جا رہا ہو۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ آنکھوں کے تلے کبھی کبھی سیاہ دائرے ناچنے لگتے ــــ وہ چلتا رہا مگر خیال نہ رہا کہ کدھر جا رہا ہے، کہاں جاتا ہے ــــ یکایک اس کی پیشانی سے کوئی سخت چیز ٹکرائی، ساتھ ہی کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گیا۔ اور متوحش ہو کر بغل میں دیکھا "بابو جرا دیکھ کے چلو، بھیڑ ہے" ایک رکشہ والا کہہ رہا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ بے خیالی میں وہ غلط راستے پر آ گیا ہے۔ اور اس وقت شہر کے مشہور غلہ کے بازار میں

کھڑا ہے۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی بیل گاڑی کے بانس سے لگی تھی جس میں چاول بھرا ہوا تھا۔ اس کے ملاقاتی کا مکان وہاں سے ذرا ہٹ کر بائیں طرف گلی میں تھا۔

چاول کے ڈھیر دیکھ کر اس کے ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گئے۔ مگر وہاں رکھا ہی کیا تھا بجز حسرت و یاس کے، اس کے دل سے ایک کراہ نکلی اور لامحدود فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اس نے چاولوں کے ڈھیر پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور لوگوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک فقیر نے ایک مہاجن سے سوال کیا "بھگوان کے نام پر ـــــ" اور کاسۂ گدائی بڑھا دیا۔ مہاجن نے ایک مٹھی چاول اس میں پھینکا۔ اسے خیال آیا وہ بھی ایسا ہی کرے، مگر ساتھ ہی اس نے اپنے دانت بھینچ لئے، اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہوا۔ "کیا اب میں اتنا گر گیا ہوں؟" اس نے سوچا۔ "اس میں توہین ہے اس کی خودداری کی، بے عزتی ہے اس عظیم کام کی جس کا واسطہ دیا جاتا ہے ـــــ یہ تو اسے کبھی گوارا نہ ہوگا اس سے تو اچھا ہے کہ ـــــ اور آگے وہ نہ سوچ سکا۔

اس کے ذہن کے ایک گوشہ سے یک بیک ایک نئے طرح کے خیال نے سر ابھارا۔

لوگ خرید و فروخت کر رہے تھے۔ لوگ آتے، چاول دیکھتے۔ دکاندار ایک مٹھی چاول گرد و صاف کر کے تعریفیں کرتے ہوئے دیتا۔ لوگ اگر پسند نہ کرتے تو دوسری جگہ جانے لگتے تو دوکاندار کہتا "بابو، اس چاول کو لیتے جاؤ۔" ایسا بازار بھر میں رہے گا تو اور مٹھی بھر چاول دے دیتا ـــــ اسے خیال آیا کیوں نہ وہ بھی ایسا کرے۔ پچاسوں دکانیں ہیں۔ سب سے ایک ایک مٹھی لے کر رکھتا جاؤں۔ اس طرح سے تو کچھ مشکل نہ ہوگا اور رکھنے کا سوال تو اس نے سوچا کہ پتلون کی جیبیں کافی ہوں گی۔

یہ خیال آیا اور اس کے دل و دماغ پر چھا جانا چاہا۔ سیاہیوں کی پیداوار یہ انوکھا بلکہ اچھوتا خیال بالکل کسی کاذب کی طرح تھا۔ جو وہ بعد میں آنے والی پاکیزہ روشنی کا پیش خیمہ ہوتی ہے مگر اکثر و بیشتر مبتلائے فریب بھی کر ہی دیتی ہے۔

لیکن ساتھ ہی اس کے وسیع دماغ کے ان گنت گوشوں سے ننھی ننھی شعاعیں خارج ہونے لگیں۔ کچھ اور ہی خیالات نے اس کا دامن پکڑنا چاہا۔ یہ انسانیت کے منافی ہے۔ تمہاری محبوب کو اس سے ٹھیس لگے گی ـــــ

اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے تیزی سے گردش کرنے لگے۔ پھر وہ بڑے سے بڑے ہوتے گئے یہاں تک کہ اس کے سامنے یہاں سے وہاں تک بہت دور تک سیاہیوں کا، ظلمتوں کا سیاہ دائروں کا ایک عظیم الشان

دریا موجیں مارنے لگا اور دور حدِ نظر پر ایک جگہ سے مسرور کن سکون بخش نورانی شعاعیں فضا میں بکھر رہی تھیں، موجوں میں کبھی ننھی قندیلیں ابھرتیں اور پھر ڈوب جاتیں۔ اس کے قدم یکایک لڑکھڑا گئے۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرے شخص نے نیم استہزائیہ انداز میں اسے بازوؤں سے تھام لیا اور کہا۔ "مسٹر ہوش نہیں ہے کیا؟ یہ بازار ہے" ـــــ اس کی آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ اس نے سوچا، نہیں مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میری اپنی خودی خود میرے ہاتھوں مر جائے۔ "اف ـــــ" لیکن یہ نہ تو چوری ہے نہ گداگری۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟" اس خیال نے اسے دبوچ لینا چاہا۔ "ایک وقت کچھ کھا کر تو کم از کم دو سرے تین دنوں تک حالات کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔"

کسی نامعلوم خیال کے تحت وہ ہٹ کر سڑک پر آگیا، اس نے سوچا کہ یہاں سے نکل چلوں، سڑک پر ایک طرف ابلے ٹھیلے والوں کا انبار لگا تھا۔ پاس سے ایک رکشا گزرا۔ وہ ہٹ کر کنارے آگیا۔ ذہنی جنگ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پیٹ میں کچھ عجیب طرح کا درد ہونے لگا۔ اسے اپنے اندر کسی اہم چیز کی کمی کا احساس ہونے لگا۔

ایک بیل گاڑی والے نے چیخ کر کہا۔ "ہٹ جاؤ بابو جی بیل مار دیگا"

وہ بوکھلا کر جلدی سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا اور دوکان کے قریب آگیا۔ لوگ آ رہے تھے۔ لوگ جا رہے تھے۔ لوگ خرید رہے تھے۔ دوکاندار نے اسے قریب دیکھ کر سمجھا کہ وہ بھی کچھ چاول خریدے گا۔ اور اس نے ایک مٹھی چاول لے کر یکایک اس سے کہا۔ "لو بابو، بہت بڑھیا ہے، اصلی گوریا۔" اور پھر اس کی طرف بڑھا دیا ـــــ یونہی غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ پھیل گئے۔ اور چاول اصلی گوریا۔ چاول کے دانے اس کی ہتھیلیوں میں تھے۔ شاید وہ انکار کر دیتا۔ وہ نہ لیتا مگر اس سے کچھ کہا نہ گیا جانے کیوں؟؟

ایک بار تو اسے ایسا لگا کہ وہ یہ سفید دانے نہیں ہیں بلکہ ـــــ اور وہ انہیں پھینک دے۔ مگر فوراً ہی اس کے اسی گوشہ سے تحریک ہوئی وہ کچھ عجیب سے انداز میں اسے لے کر خالی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ جیسے وہ دانے اسے سقر نام رہے ہوں۔ اور پھر مٹھی بھینچ لی۔ . . .

زندگی کو ٹھوکر لگی۔ کشتی حیات ڈگمگانے لگی۔ اس کے سر پر سے ایک کوا کوا کائیں کائیں کرتا ہوا گزر گیا۔ ایک جیپ کار اس کے پاس سے گزری اور اس کے میلے مگر بے داغ کپڑوں پر کچھ چھینٹیں ڈالتی گئی ـــــ

ہاتھی کے ہاتھ میں تشنج سا ہو رہا تھا۔ پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پیٹ میں کھرچن سی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے بڑے ہوتے

غائب ہوتے پھر موجود ہوتے۔ کبھی کبھی ان کے بیچ روشنی کا ننھا سا نقطہ بھی نمودار ہو جاتا۔ سب سے بڑھکر اس کے دل و دماغ اس کے ذہن، اسکی خودداری میں نہایت شدید جنگ ہو رہی تھی چہرہ سُرخ ہو رہا تھا جیسے سارے بدن کا خون چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ اس نے اپنی پیشانی کے دونوں گوشوں کو سختی سے دبایا۔ سر کو اُوپر کی طرف جھٹکا سا دیا۔ جیسے اس پر کوئی ناگوار سی چیز آپڑی ہو۔

کسی نہ کسی طرح چلتا ہوا وہیں تھوڑی دور میل کے ایک بڑے سے درخت تک پہنچا اور اس کی مضبوط جڑ پر بیٹھ گیا۔ وہ فیصلہ کرنا چاہ رہا تھا! ایک آخری فیصلہ۔ مگر یہی تو دشوار تھا۔

اب بھی موقع ہے سنبھل جاؤ۔ کوئی اس سے کہتا۔ تو بھوکا ہے۔ اسکو احساس ہوتا۔ مگر ایک بار گر جانے کے بعد گرتا ہی جائے گا۔ مگر بھوک ؟؟

"اپنا کوٹ بیچ ڈال" "قلم موجود ہے" "اب تو نے ہی لیا" یہ شدید ترین وار تھا۔ مگر ــــ اس نے ایک آخری کوشش کی۔

اب اس کی نگاہیں دور افق میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ مگر اس کا ذہن بے حس ہو رہا تھا۔ اس کا تخیل کچھ نہ کچھ سکا۔ شاید اس لغزش نے اس کی متاعِ حیات لُوٹ لی تھی۔" اس خیال کے آتے ہی اس کا جسم کانپنے لگا۔ اور آنکھوں میں تارے لرزنے لگے، ساتھ ہی تصور کے کانوں میں پُر زور آواز سنائی دی۔ جیسے کسی کی آخری آواز ہو۔ "تم نے چکھے تو کھایا ہے۔ اب بھی موقع ہے ٹھوکر کے بعد سنبھلا بھی تو جا سکتا ہے۔ کیچڑ کے دھبے دھوئے بھی جا سکتے ہیں ــــ" مگر اس سے کیا ــــ مگر اس سے کچھ نہیں ــــ

وہ سوچے جا رہا تھا ــ وہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا ــ اور فیصلہ ہو ہی تھا۔ آخری فیصلہ۔

اور پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ نمناک آنکھیں خشک کیں۔ مٹھی میں دبے ہوئے دانوں پر اس نے فیصلہ کُن نگاہ ڈالی۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ شاید راستہ متعین ہو گیا تھا۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔

اب یہ آپ بتائیں کہ کیا ہوا ہوگا۔ تین دن کی شدید بھوک، ایسا انسان اس کی خودی، اس کے اصول، اور ایک آسودگی کا ذریعہ جس میں بظاہر کوئی خرابی نہیں، ایسی کشمکش میں، ایسی حالت میں آپ کیا کرتے، ہاشمی نے کیا کیا ہوگا، یہ آپ بتائیے۔

ھارون الرشید

روشنی

"اور تم کیا کرو گے ؟"

"میں تو آرٹسٹ بنوں گا" صلاح الدین نے جواب دیا۔

"اور آپ مسٹر ؟"

"میں ـــــ میں تو لالہ اور ڈالمیا بنوں گا" حیدر نے قریب قریب چیختے ہوئے کہا۔

"اور آپ کا کیا ارادہ ہے ؟"

"جی ـــــ ویسے تو کوئی خاص ارادہ نہیں" شاکر نے کہنا شروع کیا "لیکن اگر قسمت نے ... تو دیا تو میں ہندوستانی فلموں کا معیار اتنی بلندی پر پہنچا دوں گا ـــــ کہ اگر ہالی ووڈ والے اس بلندی کی طرف نظر اٹھائیں تو ان کے سر سے ہیٹ گر جائے"

"جی واہ صاحب ـــــ اندھوں نے ماٹی روشنیاں دور اپنے ہی اپنوں در بدیں"

"مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ آپ نے مجھے نہیں پوچھا کہ میں کیا بنوں گا خیر یہی! یہ میرا فرض مجھے جھنجھوڑ رہا ہے ـــــ میری غیرت اور شرافت مجھے اکسا رہی ہے کہ تم جو چاہتے ہو اپنے دوستوں سے کہہ دو ـــــ لہٰذا

کلیجہ تھام لو بیٹھے سنو میری داستاں میری"

"میں کیا چاہتا ہوں ـــــ میں ایک انقلاب چاہتا ہوں" سعید نے کہنا شروع کیا۔

"ایک ایسا انقلاب جس میں ہر امیر غریب ہو جائے اور ہر غریب امیر بن جائے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اونچے اونچے محلوں میں گھپ اندھیرا اور گھٹا ٹوپ تاریکی قبضہ کر لے ـــــ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بھگوان کے سوتیلے بیٹوں کی بدقسمتی کے ساتھ ان کے جیون ان کی زندگی، ان کے چھوٹے چھوٹے سے گھروندے بھی مٹ جائیں غربت اور تنگدستی کے کالے اور بھیانک بادل اڑتے رہیں

ہن ہن کر لہراتے رہیں ـــــ ڈستے رہیں !!

میں یہ چاہتا ہوں کہ اونچے اونچے محلوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے جائیں تاکہ سفید، دودھیا اور چمکیلی روشنی چھن چھن کر غریبوں کی کٹیاؤں میں پہنچے تو ان کی زندگی بھی دودھیا اور چمکیلی ہو جائے ـــــ لیکن اس کے لئے لینن کی طرح جد و جہد ـــــ اسٹالن کی طرح ہمت اور گورکی کی طرح ایک مستقل مزاجی کی ضرورت ہے ... میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس وقت تو لینن اور اسٹالن پیدا ہی نہیں ہو سکتے جب تک گورکی کا وجود نہ ہو ـــــ اور اسی لئے میں گورکی بننا چاہتا ہوں ـــــ ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر ـــــ پھر میں اسٹالن پیدا کر سکتا ہوں۔ لینن بنا سکتا ہوں ـــــ سفید دودھیا اور چمکیلی روشنی پھیلا سکتا ہوں"

"اللہ اکبر ـــــ اللہ اکبر" دور سے اذان کی دل خوش کن آواز آنے لگی۔

"ارے اذان ہو گئی ـــــ بھئی دیکھنا کیا وقت ہوا ہے"

"چھ بجنے میں ... پندرہ منٹ باقی ہیں" صلاح الدین نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا

"ہائیں ! کیا کہا - چھ بجنے میں پندرہ منٹ ـــــ ارے بھائی جلدی چلو ورنہ فلم چھوٹ جائے گی" وہ تو پہلے ہی سے چونکا دیا شاکر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا - اور موذن اپنی حلق کی آخری گہرائی سے پکار رہا تھا

"اللہ اکبر - اللہ اکبر"

"لا الہ الا اللہ"

اور مسجد کے گنبد پر ایک بوڑھا گدھ سر لٹکائے یوں بیٹھا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا فلسفی ہے اور ہماری گفتگو پر سعید تبصرہ کر رہا ہے یا کسی پیچیدہ مسئلے کو سلجھا رہا ہے اور اس کا مسئلہ اندھیرے کی تہہ میں چھپتا چلا گیا پھر اس میں گرہیں پڑ گئیں ـــــ وہ گھبرا کر اڑ گیا - اور مسجد کا گنبد ویران ہو گیا

اور مسجد کے دروازے بند ہو گئے ـــــ اور سینما ہال کا دروازہ

کھل گیا اور ہر طرف دودھیا، سفید چمکیلی اور نرم روشنی پھیل گئی ——
اور تیسری گھنٹی کے ساتھ ہال میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا —— اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ سینما کی گھنٹی نہیں بلکہ کسی خوفناک دیو کی آواز تھی —— جو گرجتا اور چنگھاڑتا ہوا آیا اور ایک معصوم خوبصورت پری کو لے بھاگا ——!

فلم ختم ہو گئی اور پھر ہر طرف سفید روشنی کی کرن پھوٹ نکلی۔ اور میرے خیالات پھر الف لیلے کے اوراق الٹنے لگے کہ دیو کی جان ایک بہت بڑے اژدہے میں تھی۔ اور اس اژدہے کو حاتم طائی نے مار ڈالا —— اور دیو مر گیا —— اور وہ خوبصورت پری آزاد ہو گئی۔

پھر وہ اپنے محل میں واپس آگئی۔ اس نے پورے محل میں چراغ جلائے اور نرم سفید روشنی کی ایک دھار بہ نکلی ——!!

"ہاں کس خیال میں غرق ہو" صلاح الدین نے کہا۔ "کہو فلم پسند آئی؟"

"سوچ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ اندھیرے اور اجالے میں جو فرق ہے وہ کس طرح ختم ہوگا۔ کیسے ختم ہوگا۔ کب ختم ہوگا —— کیوں نہیں ساری دنیا میں گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ کیوں یہ روشنی صرف بڑے بڑے محلوں میں قید ہے۔ کیوں نہیں دودھیا، سفید اور نرم روشنی کا سد ٹوٹ جاتا —— امیر اور غریب کا یہ فرق کس طرح دنیا سے مٹے گا۔ دونوں ہی ماں کے پیٹ سے ننگے پیدا ہوئے تھے —— دونوں ہی بھوکے تھے پھر آج کس طرح ایک کے پاس کپڑے کی گٹھڑیاں موجود ہیں۔ اور دوسرا ایک گز کو ترس رہا ہے۔ ایک کے پاس لاکھوں من غلہ ہے اور دوسرا دو دن سے بھوکا کیوں ہے۔ آخر کیوں —— بولو بولو۔ جواب دو؟؟؟!

اور وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جیسے وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ بتاؤ ایسا کیوں ہوا —— ایسا کیوں ہوتا ہے؟

لیکن سب کی نظریں ٹکرا کر زمین میں دھنس گئیں —— اور سب تھکے تھکے قدموں سے چلتے رہے۔ بالکل خاموش —— بالکل اداس۔۔۔

اور پھر مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی —— گدھ پھر پھڑا کر اڑ گیا۔

"نو بج گئے۔ اچھا میں تو چلتا ہوں —— ورنہ کل کی خیر نہیں اور مجھے امتحان ختم ہوا ہے اور اب تک گھر نہیں گیا" —— حیدر نے سبھوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو —— وہ دیکھو" سعید نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور سب کی نظریں آسمان پر گڑ گئیں۔ ایک ستارہ اپنے پیچھے دودھیا چمکیلی اور نرم روشنی کی ایک مہین سی تار کھینچتا ہوا تاریکی کی گود میں دفن ہو گیا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ "تم اس سیاہی اور تاریکی کو دور نہیں کر سکتے۔"

—— سب مل کر اٹھے مسجد پر پہنچے ——! اور اذان کی آواز دھیمی ہوتی گئی اور دھیمی ہوتی گئی۔ اور پھر رات کی سیاہی میں آواز کھو کر رہ گئی۔ ایک چوراہے پر پہنچ کر سب لوگ رک گئے۔

"پھر کب ملنا ہوگا" حیدر نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

"جب آپ لوگوں کی رائے ہو" سعید نے ایک مختصر سا جواب دیا۔

"کل شام کو پانچ بجے" شاکر نے اپنی رائے پیش کی۔

"ٹھیک ہے" سبھوں نے ایک ساتھ کہا۔ اور چاروں الگ الگ راستے پر چل پڑے۔

میں گھر پہنچا اور لیٹ گیا —— میں نے ہزاروں کروٹیں بدل ڈالیں مگر نیند نہیں آئی۔ اور ہر کروٹ کے ساتھ میری کھٹیا چرمر چرمر کرنے لگی جیسے اسے بھی سکون نہ ہو۔ اور وہ بھی میرے ساتھ پریشان ہو۔ اور میں اکتا کر کھٹیا سمیت باہر آگیا۔ باہر مسجد کے سامنے اور ایک دو مدھم تنتیں سانس لے رہی تھیں۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک جاگتا رہا اور کس وقت مجھے نیند آئی۔ لیکن صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو مسجد کے دروازے بند ہو رہے تھے —— اور لوگ نکل رہے تھے۔ ایک بوڑھے کو کھانسی آئی —— کھوں اکھوں اکھوں!!! آخ —— آخ تھو —— اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس نے میری جوانی پر بلغم پھینک دیا۔ میلا اور میلا بلغم۔ جیسے اس نے منہ پر تھوک کر میری فطرت کو جھنجھوڑ دیا۔ مجھکو اپنی اصلیت سے روشناس کرانا چاہا۔ مجھکو اپنے نام سے اور اپنے آپ سے نفرت معلوم ہونے لگی۔ اپنی جوانی سے گھن آنے لگی —— کیوں میں خدا اور اس کے رسول کو دھوکا دے رہا ہوں۔ جبکہ میں نے اتنی ساری عمر میں اس کی ایک بھی حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اس کی ایک بھی بات نہیں مانی —— اس کی ——

"بالو جی" مہتہ نے کہا "ذرا پیر ——!"

"ارہ —— ہاں۔ ہاں —— یہ لو" اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

وقت گزرتا گیا —— صلاح الدین۔ شاکر۔ حیدر اور سعید آتے رہے —— مسجد کا مؤذن پکارتا رہا —— اور پھر اس کی آواز سے گدھ پھڑ پھڑاتا رہا —— بوڑھا نمازی کھانستا رہا —— اور میری جوانی پر بلغم کی تہہ جمتی گئی —— کہ ایک روز صبح ہی صبح مجھے کسی کی آواز نے چونکا دیا ——

"بالو جی —— تار"

اور میں تار کا لفظ سنکر چونک پڑا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے

ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا ۔ لکھا تھا come sharp Mother ill اور میں کسی سے ملے بغیر چل پڑا ـــــــ راستے بھر میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال آتے رہے ۔ نہ جانے ماں کیسی ہے ۔ کہیں طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی ہے ۔ نہ جانے میں انھیں ـــــــ لاحول ولا قوۃ

اور زندگی میں پہلی بار میرا سر اُس دیکھی طاقت اور شعور سے بالا طاقت کے سامنے جھکا جا رہا تھا ۔ اور عقیدتمندی کے آنسو آنکھوں میں جھلک رہے تھے ـــــــ اور میں زندگی میں پہلی مرتبہ خدا سے دعا مانگ رہا تھا ـــــــ کہ میری ماں کو اچھا کر دے ۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے ۔ مجھے دعا کے طریقے دعا کے بول یاد نہیں تھے ۔ مگر پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ خدا میری دعا قبول کرے گا ـــــــ اور جب میں گھر پہنچا تو دیکھا ماں کھٹیا پر بیٹھی ہے وہ مجھے دیکھکر اُٹھنے لگیں ـــــــ میں نے انھیں بٹھاتے ہوئے کہا ـــــــ "اب کیسی طبیعت ہے آپ کی"

"اچھی ہوں بیٹا ـــــــ بہت اچھی ہوں ۔ ڈاکٹروں نے تو جواب دیدیا تھا ۔ نہ جانے کس کی دعا خدا نے سُن لی"

ـــــــ مسجد کے موذن نے پکارا ۔ "اللہ اکبر" ـــــ "اللہ اکبر"

"جاؤ بیٹا" ماں نے کہا "غسل کر لو ۔ سفر کی تھکاوٹ دور ہو جائیگی"

اور میں پہلی مرتبہ خدا کے دربار میں حاضر ہوا ۔ اور مجھے ایک ایسی خوشی ملی مسرت ہوئی ۔ جیسے ایک بھولے ہوئے مسافر کو راستہ مل جانے کے بعد ۔ جیسے ایک قیدی پرندہ کو آزاد ہو جانے کے بعد ۔ جیسے ایک مجرم کو پھانسی کے تختے پر سے آزاد دیے کے بعد ـــــــ !

تین مہینے کے بعد جب ماں کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی ۔ میں نوکری کے سلسلہ میں شہر آگیا ! پانچ بج رہے تھے ۔ میں نے سوچا چلو ذرا دوستوں سے مل آؤں ۔ نہ جانے وہ لوگ کیا کرتے ہوں گے ۔ میں سب کے پاس گیا ۔ لیکن کسی سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ میں نے دیکھا خاکی وردی میں ملبوس ہاتھ میں دو تین موٹی موٹی کتابیں لئے حمید چڑھا آ رہا ہے جب میں بالکل قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس

کی بائیں طرف خاکی وردی میں لال حرف سے BIRLA لکھا ہوا ہے ۔ اور پھر اس نے مجھ سے کہا ـــــــ "دیکھو ـــــ دیکھو میں کیا کہتا تھا کہ میں BIRLA DALMIA برلا اور ڈالمیہ ہوں گا دیکھتے ہو میرے سینے پر کیا لکھا ہے ۔ اور یہ کہتے کہتے اس کے ویران اور خشک آنکھوں میں دو موٹے موٹے قطرے لرزنے لگے ۔ میں نے پوچھا ۔ اور سب کہاں ہیں"

"اور سب ـــــــ سبھوں کا ایک حال ہے ۔ اس نے کہنا شروع کیا ۔ "صلاح الدین بھی آرٹسٹ بن گیا ـــــ اور دھرمتلہ کے فٹ پاتھ پر اب بھی بیٹھا اپنی مفلسی اور غربت کی تصویر بناتا ہوگا ـــــ شاکر بھی فلمی دنیا میں ہے ۔ اب بھی وہ سیٹی سینما میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ بیچتا ہوگا ـــــ سعید بھی اخبار میں کام کرتا ہے ۔ وہ ابھی ابھی اسی راستے سے چیختا اور چلاتا ہوا گذرے گا ـــــ وہ دیکھو ـــ وہ دیکھو سعید آرہا ہے ۔ دیکھو اس کے ہاتھ میں اخبار کا ایک بنڈل ہے ۔ سُنا تم ۔ وہ کیا چلا رہا ہے" ۔ اور میں نے غور سے سُننا شروع کیا ـــــ سعید چلا رہا تھا ـــ "آج کی تازہ خبر ـــ دنیا کا سب سے بڑا ڈکٹیٹر چل بسا ۔ اسٹالن کی موت ـــ تمام دنیا پر غم کے بادل ـــ روس میں ماتم ـــــ ـــــ آج کی تازہ خبر ـــ آج کی تازہ خبر ـــ !!"

اور میرے دماغ نے آج سے ایک سال پہلے کی باتیں اُگلنی شروع کر دیں ۔

"میں آرٹسٹ ہوں گا" ـــــ !

"میں برلا اور ڈالمیہ بنوں گا" ـــــ !!

"میں ہندوستانی فلموں کا معیار بلند کروں گا" ـــــ !!!

"میں اسٹالن پیدا کروں گا ۔ میں گورکی ہوں گا" ـــــ !!!!

ـــــــ خیالات کا تجزیہ ۔ اسٹالن ؟ لینن ؟؟ گورکی ؟؟؟

"نہیں نہیں ـــ میرا ـــ میرا نہیں سارے سنسار کا رہبر صرف "نئی انقلاب ، نئی معاشرت ـــ نئی تمدن ـــ نئی اخلاق ـــ نئی انسانیت ـــ نئی جامع ـــ نئی آخر" ـــــ دفعتاً مسجد کے موذن نے پکارا ـــــ اور پھر پھر ذاکر اُڑ گیا ـــــ "اللہ اکبر" ـــ "اللہ اکبر"

اور میرے قدم خود بخود مسجد کی طرف اُٹھنے لگے ـــــ !!!

تحریر کی جانچ

تصنیف :۔ بالتوج اسٹین (ہنگری)
ترجمہ :۔ سیف نوگانوی

"جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔ بیبو جی مجھے زیادہ وقت نہیں ہے۔" کہتے ہوئے مسٹر ریچرڈسن اوریول نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ بھولی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا لکھ دینے کھیلنا جس سے ملاقات کرنے کے لئے اُسے ایک گھنٹہ سے زیادہ انتظار کرنا پڑا۔ اور اس کے لئے اُسے دربان کی جھڑکی بھی سننی پڑی۔ اس طرح روکھا برتاؤ کرے گا وہ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے ریچرڈسن کی طرف دیکھنے لگی۔ ریچرڈسن نے پھر اُسی رکھائی سے کہا۔ دیکھو بیبو جی پہلے بتا دو اگر تم میرے پاس روپیہ پیسے کی مدد مانگنے آئی ہو تو مہربانی کر کے واپس لوٹ جاؤ اور وقت برباد ہی مت کرو۔" بڑھیا نے روندھا ہوا گلا صاف کرتے ہوئے ہمت کر کے کہا۔

"میں تم سے روپے پیسے نہیں مانگنے آئی ہوں۔ ہاں ایک عرض ضرور ہے۔"

"جلدی کہہ ڈالو فوراً مجھے ایک بہت بڑے تاجر سے ملنے جانا ہے۔"

"میرے بڑے بیٹے سٹیویل کو تم اپنے دفتر میں جگہ دینے کی مہربانی کرو۔ وہ بی کام میں اوّل آیا ہے اور بی ایل میں بھی۔ بہت قابل خوش اخلاق اور محنتی ہے۔ شراب نہیں پیتا۔ جوا نہیں کھیلتا یہاں تک کہ ہم عمر عورتوں سے بھی نہیں ملتا۔ تمہارے محکمہ کے لئے وہ بہت قابل ثابت ہوگا۔" بڑھیا نے کہا۔

"لیکن میرے یہاں جگہ کہاں ہے؟" ریچرڈسن نے تعجب کیا۔

"جگہ تو ہے۔ دو خالی جگہوں کا اشتہار ہوا ہے جیسے پتہ لگا ہے۔"

"اس میں ایک مجھے بھرا نہیں ہے۔"

"ایک تو ہے۔" "خیر بی زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم عرضی بھیج دینا۔"

"عرضی لکھا کر لائی ہوں۔" کہتے ہوئے بڑھیا نے عرضی کا غذ میز پر رکھ دیا اور معافی مانگ کر چلی گئی۔ اس کے چلے جانے پر ریچرڈسن نے غصہ میں عرضی پھاڑ دی اور بڑبڑانے لگا۔ "ان غریبوں اور رشتہ داروں سے تو بس ناک میں دم ہی کر دیا ہے۔" کچھ لمحے بعد اسے یاد آیا۔ برسوں پہلے بڑھیا مجھے کتنا چاہتی تھی۔ میرے لئے گرم گرم نان لاتی تھی۔ گئے وقتوں کی یاد ستاتی تھی۔ میں نے برا کیا مجھے عرضی تو کم از کم نہیں پھاڑنی چاہئے تھی۔ خوش قسمتی سے وہ لڑکا اگر انٹرویو میں چُن لیا جاتا تو میرا کیا بگڑتا۔ مسٹر ریچرڈسن مضطرب ہو گئے۔ انھوں نے اپنے سکریٹری کو اطلاع دی کہ آدھے گھنٹے تک کوئی ان سے نہ ملے۔ دروازہ بند کر کے انھوں نے عرضی کے ٹکڑے جمع کئے۔ اور اپنے ہاتھ سے اس کی نقل کر ڈالی۔ عرضی اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو تھماتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "دیکھو اس کو بھی رکھ لو۔ میرا رشتہ دار ہوتا ہے۔ لیکن اس وجہ سے اس کی رعایت کرنے کی قطعی ضرورت نہیں انٹرویو میں پورا اترے تو لینا ورنہ نہیں۔"

کچھ دنوں بعد بوڑھی بھولی کی خبر آئی۔ اس نے بڑی ناامیدی سے کہا کہ اس کے لڑکے کو نوکری نہیں ملی حالانکہ انٹرویو میں وہ اوّل آیا تھا۔ جس شخص کو اس جگہ رکھا گیا ہے وہ خود رئیس ہے اور بدکرداری کیلئے شہر بھر میں بدنام بھی ہے۔

مسٹر ریچرڈسن نے جھنجلا کر کہا۔

"میں اس کی جانچ کروں گا۔ .... ابھی مجھے وقت نہیں ہے۔ گورنر کے یہاں جانا ہے۔ ...."

بڑھیا کے چلے جانے پر انھوں نے اپنے سکریٹری سے اس تقرر کے بارے میں پوچھا۔

"کیوں وہ لڑکا قابل نہیں تھا؟"

"نہیں صاحب انٹرویو میں تو اوّل آیا تھا۔ لیکن۔ ....."

"تو پھر" جھلا کر ریچرڈسن نے پوچھا۔

"آپ کے حکم کے مطابق ہم نے اسکی عرضی تحریر جانچنے کے لئے ماہر تحریر کو دی۔ اس نے اپنی جانچ میں بتایا تھا کہ ایسے تحریر لکھنے والا شخص۔ جواری۔ شرابی۔ اور بدکار ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اُسے نہیں رکھا۔" مسٹر ریچرڈسن کے ہاتھ سے پائپ چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

(ترجمہ بتوسط ہندی)

ایڈورڈ کرینک شا

روسی مصنّفین کا مقام ـــ آج کے حالات میں

(مندرجہ ذیل مقالہ ہندوستان ٹائمز ۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا ہے۔ کمیونسٹ مصنفین کو جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ غیر متوقع نہیں ایک کلیت پسند نظام میں ایسی دشواریاں پیش آنی چاہئیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ روسی مصنفین ان دشواریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ بالخصوص اب جبکہ پالیسی کا رخ پیچھے پلٹ کر اپنی سابقہ روایات کی طرف آرہا ہے۔ ـ ادارہ)

برسوں کے بعد ماسکو میں ایک دلچسپ ترین موقع آیا۔ اظہار بیان کا یہ انداز مصنفین کی ایک ایسی کانگریس کے لئے جو ایک سست سالی کے لئے ممتاز تھی، بظاہر غلط معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت میں سست سالی بھی دلچسپی ہی کا جزو تھی۔ وہاں آتش افشانیاں نہیں ہوئیں۔ مصنفین اپنے اس مقام کو محفوظ تر بنانے میں لگے رہے۔ جو انھیں اسٹالن کی موت کے بعد حاصل ہوا۔ یہ مقام بہت اہم ہے۔

روسی مصنفین سے یہ توقع لگانی درست نہیں کہ وہ عموماً ادب برائے ادب یا خود نمائی کی خاطر خود نمائی کرنے پر یقین رکھتے ہوں گے۔ ان کے یہاں تعلیمی و اصلاحی عناصر پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔ ٹالسٹائی بھی جب یہ کہتا ہے کہ جوتوں کا ایک عمدہ جوڑا شکسپیر سے زیادہ اہم ہے تو اس لحاظ سے وہ اپنے مرکز سے دور نہیں معلوم ہوتا۔ انیسویں صدی کے روسی مصنفین کا ایک سلسلہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ جن کی نظر میں ادب کا ایک سماجی مقصد ہونا ہمیشہ ضروری رہا ہے۔

ادیب کی یاسیت

یہ بات کہ روایت کا وجود ہے آسانی سے ٹھیک ثابت کی جا سکتی ہے

بہت سے دلائل ہیں جو موافقت میں دیئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ممکن ہے کہ ایک انفرادیت پسند مصنف کے خلاف جو اظہار خیال کی آزادی کے پردے میں یہی یاسیت کو دوسروں پر عائد کر دیا جاتا ہے دلائل کا ایک محاذ قائم کر دیا جائے۔ روسی مصنف کہے گا "تو کچھ آپ کر سکتے ہیں اگر روس کا شخص ناامیدی کے سوا کچھ نہیں تو کم سے کم خاموش رہ کر ہی خوش دوقی کا ثبوت دیجئے" یہ بات تو تھی ہے ـــ اگرچہ جواباً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی نہیں جو ایک کلیت پسند ریاست کے نظام میں قابل عمل بھی ہو۔

Zhdanovism کو کبھی بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ فن کاروں پر کچھ پابندیاں عائد کر دینے میں ـــ اور پوری سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے انھیں نعرے اور مخصوص سرکاری پالیسیوں کی تبلیغ کرانے میں بہت بڑا فرق ہے لیکن Zhdanovism اسٹالن کے ساتھ مر چکا ہے۔ روسی مصنف سے ابھی تک یہی توقع لگائی جا رہی ہے کہ وہ کمیونسٹ حکومت کے ساتھ ساتھ چلے گا لیکن کریملن اب یہ بتانے کی طرف مائل نہیں کہ اسے کیا لکھنا چاہئے۔

تقریباً ایک برس سے بڑی غیر یقینی پھیلی ہوئی ہے۔ کھلے ہوئے جذبات عالیہ میں جو اُبال ۱۹۵۲ء کے آخر میں بند حصوں سے ڈھیلے ہونے سے آیا تھا اسے سختی سے بٹھا دیا گیا ہے۔ بہت سے ایسے افراد پر حملوں اور دہشت انگیزی کا سلسلہ شروع ہو گیا جو سنٹرل کمیٹی کی نگاہوں میں حد سے آگے بڑھ چکے تھے۔ اور انھیں تیز لہجے میں برا بھلا کہا گیا۔ اہرن برگ کو اظہار رائے کے واضح رجحان کی بدولت اور زورین (Zorin) کو اس لئے کہ اس نے حکومت کی طلب پر اپنے طنز کو غیر محتاط طریقہ سے استعمال کیا تھا۔ سرکاری طور پر اس بات سے اتفاق ظاہر کیا گیا کہ سوویٹ یونین میں بہت سی چیزیں غلط ہیں اور ان پر طنز کیا جا سکتا ہے لیکن بات کہنے اور کرنے کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔

زورین کے ڈرامہ "مہمان" (The Guests) کو اس کی ایک بھیانک مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس میں ایک پرانے تحلیت پسند قسم کے انقلابی سے جو لینن کے آمادۂ جنگ رہتا تھا ـــ اس کے ہی ایک ایسے لڑکے کی کشمکش دکھائی گئی تھی جسے نئی بیوروکریسی کے ممبری حیثیت سے بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ اس کے پاس موٹر کار بھی تھی ایک دیہاتی بنگلہ بھی تھا اور وہ ہمیشہ ایسے اتفاقات پر نظر جمائے رہتا تھا جو مفید مطلب ثابت ہو سکیں۔ زورین کا قصور یہ تھا کہ اس نے اس نوجوان Kirpochev کے ناخوشگوار قسم

نے کیریکٹر کو روسی نظام کی پیداوار بنایا تھا۔ اس پر تنقید کی گئی کہ یقیناً ہمارے اندر Kirpichev موجود ہیں لیکن وہ نظام کی پیداوار نہیں، وہ ماضی کی افسوسناک باقیات ہیں۔"

کیا دھندلکا کم ہو رہا ہے

۱۹۵۴ء کا بیشتر حصہ ایسا رہا کہ مصنفوں اور فن کاروں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں اگر وہ اپنی تخلیقات کو خواب آور گولیاں بننے سے روکتے تو ابھی حکومت کے مطلوبہ اثرات پیدا کر پانے جا مجرم الزام لگایا جاتا کہ انھوں نے حقیقت سے آنکھیں پھیر لی ہیں اور اگر وہ حقائق کی عکاسی کرتے تو اعتراض ہوتا کہ انھوں نے تصویر کو بگاڑ کر پیش کیا ہے۔

ماسکو کی حالیہ آل یونین کانگریس کے بعد ان لوگوں کو پہلے سے زیادہ خوشی محسوس ہونی چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ ابھی تک ادب کا اولین فرض پارٹی کی خدمت ہی سمجھا جاتا ہے اور یہ بات بھی، تاہم واضح ہے کہ جس رفتار پارٹی یہ جان لیتی ہے کہ اسے کس چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت بھی جس چیز کے بارے میں وہ کافی دھندلکے میں ہوتی تو وہ جانتی ہے ——— مگر اس کے کرتے لازماً زیادہ زوردار ادب کی ضرورت ہے۔ اور اب غالباً آخری طور سے یہ طے ہو چکا ہے کہ نسخوں کے مطابق کتابیں نہیں تیار کی جاسکتیں۔

اس اجتماع کے موقع پر مصنفین نے محسوس کر لیا کہ ان کے اندر اس خیال کا مذاق اڑانے کا رجحان کافی مضبوط ہو چکا ہے۔ ناول نگار فیڈن (Fedin) نے کہا: "لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ سوشلسٹ حقیقت پسندی کی جامع تعریف کیا ہے۔ اس سے زیادہ بیکار بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ بجائے اس کے ایک حصہ اشتراکی رجحان کے ہیرو کو لیجئے یا نصف حصہ منفی رجحان کے ہیرو کو۔ ایک حصہ معاشرتی تضاد کو، ایک حصہ رومانیت کو اور سو حصہ منظر بازی کو ——— آپ سوشلسٹ حقیقت پسندی کو تیار پائیں گے۔" آگے چل کر فیڈن نے کہا کہ اصل معاملہ تو انفرادی ادیب کا ہے۔

نصب العین

بہرکیف، حقیقت پسندی کی ایک تعریف ابھی یہاں موجود ہے اور روسی مصنفین اس پر یقین رکھتے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ سمونوف (Simonov) نے ان سب مسائل کو سلجھاتے ہوئے کہا: "سوشلسٹ حقیقت پسندی کی جمالیات یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ زندگی کی مادی اور حسین تصویریں پیش کی جائیں جبکہ زندگی سخت دشوار اور بے رحم نظر آتی ہو۔ لیکن یہ مطالبہ ضرور کرتی ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک نصب العین ہونا چاہیئے۔ ہر تخلیق کا وہ مقصد نظر میں رہنا چاہیئے جس کے لئے قربانی کی گئی ہو اور ہر عارضی شکست کے پیچھے آخری فتح کا امید افزا پہلو ہونا چاہیئے۔" دوسرے الفاظ میں جیسا کہ سمونوف نے خود بھی اشارہ کیا، عقیدہ کا ہونا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ کانگریس میں Zhdanovism کی بدترین تخلیقات پر پھبتیاں کسی گئیں۔ عوام کو متنبہ اور اعداد و شمار میں گم کر دینے کے رجحان کو بھی زیر بحث لایا گیا۔ سمونوف نے مزید کہا: "اب میں ٹریکٹر یا سل نکالنے اور ویلڈنگ کے الجھن کا استعمال ممکن ہے، سوال صرف اتنا ہے کہ انھیں چلانے والے کس قسم کے لوگ ہیں۔" قارئین اور سامعین کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا بالخصوص Korneichuk نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور کہا کہ ڈرامہ کی سب سے اہم خصوصیت تفریحی قدر و قیمت ہے۔

اسی طرح مضامین کے لحاظ سے مصنفین کی درجہ بندی کی بھی شدید مخالفت کی گئی اور نقادوں کو بھی ہیئت اور طریقۂ اظہار سے صرف نظر کرنے پر برا بھلا کہا گیا۔ فیڈن نے کہا: "نقادوں کا فارم کے تجزیہ سے انکار formalism ہے جو بالکل الٹی شکل میں سامنے آیا ہے۔"

مختصر یہ کہ روسی مصنفین سے جس بات کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ عقیدہ کا رجحان رکھنا اور اس کو بحث ترسانا ہے۔ اور عقیدہ ظاہر ہے کہ کمیونزم ہے۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تب وہ اپنے آپ کو ہر طریقہ اور ہر ڈھنگ سے پیش کر سکتے ہیں۔ صرف عقیدہ نہ رکھنے والوں کو خاموش رہنا پڑے گا۔

آدھا تیتر آدھا بٹیر

متین طارق

کون ایسا لکھا پڑھا ہوگا جس نے اقبال کا نام اور کلام نہ سنا ہو مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آج کے نقادوں نے بہت سے پڑھے لکھوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ اقبال کوئی پرانی قسم کے میراثی تھے جن کا کلام زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں ہوتا چنانچہ بعض اوقات تو خیال گذرتا ہے کہ یہ حضرت شاعر بھی تھے یا یوں ہی عمر بھر اندھوں میں کانے سردار بنے رہے نیز اُن کے دیوان کو ہم شعر ہی کہیں یا دیوالیے کی بڑ۔ سر پیر کبھی پورب کی ہانک دی کبھی پچھم کی۔ کبھی سیاسی مسئلہ چھیڑ دیا کبھی ملکی واہ واہ نہ غم جاناں نہ شب ہجراں نہ سنگ لیلیٰ نہ محبوب کا دربان شاعری ہوئی کوئی سیاسی رپورٹ ہوگئی۔

پھر شاعر ہوتا ہے شاعری کیلئے اور شاعری اس لئے ہوتی ہے کہ قوالوں کے سوا دیں اضافہ ہو مگر یہاں لے دے کے "حقیقت منتظر" تھی سو وہ بھی لباس مجاز میں ہے اس پر طرہ یہ کہ ہر آدمی منہ دھو کر یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اقبال انہیں کے خاندان سے تھے یا اس میں کچھ جھوٹ ہے تو کم از کم انھوں نے جو کچھ لکھا وہ تو انہیں کیلئے لکھا ہے اور اگر کہیں خدانخواستہ وہ نہ ہوتے تو شاید اقبال بھی نہ ہوتے نہ شاعر بنتے نہ شعر کہتے

چنانچہ یہ اسی پاک خیال کا صدقہ ہے کہ جس کو دیکھو نعرہ لگا رہا ہے کہ

اقبال ہمارا ہے
کیونکہ وہ شاعر ہے
اقبال ہمارا ہے
کیونکہ اُس کی شاعری اشتراکیت پسند ہے
اقبال ہمارا ہے
کیونکہ اُس کا مذہب جمہوریت کا داعی ہے
ہمارے اقبال نے کہا
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
اُن کے اقبال نے کہا ہے
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جمہوریت نواز اقبال نے کہا
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے — پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

معلوم نہیں مالیخولیا کس کو ہے کیونکہ خود اقبال بڑے مولوی صاحب کے استفسار پر کہہ چکے ہیں کہ

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

اس پکی دلیل کے بعد بھی اگر آپ کا تمسخر کو ہی جی چاہتا ہے تو پھر ہاتھی اور اندھوں کی حکایت دہرائیے جس میں بقول شخصے ہر ایک نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق ہاتھی کا نام تجویز کیا تھا یعنی جس کے ہاتھ میں کان آیا اُس نے کہا چھاج ہے جس نے پیروں پر ہاتھ پھیرا وہ سمجھا کہ یہ کھمبا ہے جس نے پیٹ کو دیکھا اُس نے فیصلہ دیا کہ یہ دیوار ہے اور جس نے پونچھ پکڑی وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہو نہ ہو یہ رسی ہے

غرض جس طرح اندھوں کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی تھی اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی کی تکا بوٹی ہوئی جس کے جو سمجھ میں آجاتا ہے ——— کہہ دیتا ہے جو کہہ دیتا ہے اُسے ثابت کر دیتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ وہ نرے شاعر تھے کیونکہ شاعری کے علاوہ اور کوئی کام اُن کے بس کا نہ تھا۔ کہیں سے آواز آتی ہے کہ اقبال اشتراکیت کے پرستار تھے کیونکہ عمر بھر سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ جمہوریت پسند تھے کیونکہ اُن کا حقہ ہر کوئی پی سکتا تھا۔ کچھ اور ہیں جنہوں نے اقبال کے الحادی ہونے کا فتویٰ دیدیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ بے نمازوں نے جب کبھی نماز ادا کی تو حضرت علامہ کو دیر سے بلانا پڑا ہے۔ ایک اور صاحب جو خیر سے اب مرحوم ہیں اس سے بھی دور کی کوڑی لائے ہیں اُن کا خیال ہے کہ اگر قرآن اُردو زبان میں نازل ہوتا تو اقبال کا کلام اُن کے لئے سود مند ہوتا"

ایسی عقلمندی کی بات کو کوئی عقلمند ہی سراہ سکتا لیکن اس سے

"شاعری جزویست از پیغمبری"

سے خدا کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ کس طرح لوگوں کے دماغوں پر مسلط ہے جبھی تو اس ریڈیو اور ٹی وی کے دور میں دیوان حافظ سے فال نکالنے کا دستور جاری ہے اور خود بیچارے حافظ شیرازی

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

بہرکیف جتنے منہ اتنی باتیں ہیں البتہ ردعمل کے طور پر "اقبال بچاؤ" کی تحریک بھی چل پڑی ہے کیونکہ بقول شخصے جو آجکل میراث اقبال کو لوٹ رہے ہیں ہم اور آپ اب تک تو یہی سنتے آئے تھے کہ مال جان کا صدقہ ہے مگر علم کی دولت لٹتی ہے کم ہوتی ہے مگر یہاں ادبی لغت رتی کا رونا ہے چور دروازے سے اقبال کا کلام کہیں سے کہیں منتقل ہو رہا ہے اس لئے اس کا بچانا ہر مرد ادب پر فرض ہے جو اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے وہ کافر ہے۔

گو یہ بات بھی تند مد حدے میں کہی گئی ہے لیکن اس سے یہ ظاہر ضرور ہوتا ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی رتصدیق حرام ہے پیر اب اس آدھا تیتر آدھا بٹیر کا حل ہو تو کیا ہو؟

اگر کہیں ایک انار کا معاملہ ہوتا تو ہم کہہ دیتے کہ چلو دانہ دانہ بانٹ دو مگر یہاں معاملہ ہے شعروں کا اور وہ بھی اقبال کے یہاں ایک ہی شعر کی مختلف تعبیریں ہوتی ہیں مثلاً مرحوم کے اس شعر کو دیکھئے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

سنا ہے کہ علامہ نے یہ شعر تحریک خلافت کے لئے لکھا تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نہرو رپورٹ سے متاثر ہو کر لکھا تھا اور تو اور سینما والوں کا کہنا ہے کہ یہ شعر ایک تاریخی فلم کے لئے تیار کرایا گیا لیکن افسوس کہ اس کو اسٹیج نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی ضعیف روایت کی سیر کے کرنے کہ عہد حاضر کے شعرا سینماؤں میں گانے لکھنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اب ہو تو کیا ہو عرف کشمکش وسیع ہے آج تک شعر و ادب کی کوئی ایسی چھلنی بھی ایجاد نہیں ہوئی کہ شاعر کا کلام اس میں ڈال کر موٹا مارک کلام علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ البتہ دو تجاویز میرے دماغ میں ہیں جس میں پہلی ترکیب کاٹ

چھانٹ کی ہے یعنی ڈاک گاڑی کے ڈبے کی طرح خاص خاص درجے اول وقت نظریات کے خانے بنا لئے جائیں اور اقبال کے کلام میں سے ٹکٹوں کے میلے ٹکٹوں کی طرح ہر طرف کے لیبل کے مطابق ورق ورق شعر شعر اور لفظ لفظ اٹھا کر ہر خانے میں ڈالتے رہئے۔ اور آخر میں ہر ٹکڑے کو یکجا کر کے سی دیا جائے تاکہ دور ہی سے بنگال ہیر آئیل کی طرح پہچان لیا جائے کہ فلاں شعر یا لفظ "کارِ مزدور" کی نسل سے ہے اور فلاں "درس پیٹ" سے اور یہ نشانِ جمہوریت۔

جہاں تک شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہے وہ تو آسان ہے مگر الفاظ کا انتخاب مشکل ہو جائیگا۔

مثلاً یہ شعر

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
میں سے پھر کیا نکال کر پیوند کے لئے
رجہاں میں دانہ کوئی حیثیم اختیار کرے،

لگانا پڑے گا اس طرح اس شعر کی حیثیت بھی بلند ہو جائے گی اور وقت کا تقاضہ بھی پورا ہو جائے گا۔

ایسے ہی لفظ خودی اور خودی سے تعلقات ایک جگہ جائیں گے جس سے اہل حال کو اچھا خاصہ سرمایہ ہاتھ آجائیگا اور وہ تلاش کی زحمت سے بچ جائیں گے۔

دوسرا طریقہ ہے بھبکے کا جو کارآمد بھی زیادہ ہے اور آسان بھی ترکیب یہ ہے کہ اقبال کا آج تک کا شائع شدہ کلام ہر شہر ہر مطبع اور ہر ایک کتب خانے سے ایک جگہ گڈمڈ کر کے چولہے پر رکھ کر عرق کھینچ لیا جائے اور سب سے پہلی بوتل کا نام عرق اقبال رکھا جائے پھر اس کے بعد جوہر اقبال اور روح اقبال وغیرہ۔

کلام کی آسانی تو ظاہر ہے کہ لوگ ہمیشہ سے ایسے مرکبات تیار کرنے کے عادی ہیں فائدہ مزید یہ ہوگا کہ مشک آنست کہ خود ببوید۔ کہ عطار بگوید

شاید لوگ یہ کہیں گے کہ اس طرح تو کتب خانہ اچھا خاصہ طبیہ عطار ہو جائیگا مگر کچھ بھی ہو یہ جھگڑا مارنے کا ایک ہی نسخہ ہے جس کو از راہ اصلاح زہر مار کرنا پڑیگا

اور اگر آپ ایسا نہ کر سکیں تو حاسدیں معترض ادب جلانے سے باز آئیں اور اقبال کو اقبال ہی رہنے دیں اور اس کے کہنے کے مطابق

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے، پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

حمید اللہ خان انجم

کیریکٹر نام ہے اخلاق Discipline کا جس سے انسان کی اپنی عملی زندگی میں ایک راسخ اور مستقل میلان طبیعت پیدا ہو جاتا ہے جو بلا ارادہ خود بخود ایسا عمل کرتا رہتا ہے۔ جس انسان میں کیریکٹر نہیں وہ نہ صرف نکما اور بیکار آدمی ہے بلکہ اس کا وجود سماج کے لئے بہت مضر اور تباہ کن ہے محض علم حاصل کر لینے سے کیریکٹر نہیں بنتا بڑے بڑے عالم فاضل لوگ ایسے گذرے ہیں جو باوجود تبحر علمی اور عقلی خصوصیات کے اچھا کیریکٹر نہیں رکھتے تھے کیریکٹر پیدا کرنے کے لئے ایک مخصوص نصاب تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ محض رائج وقت کتابوں سے کیریکٹر نہیں پیدا ہو سکتا۔ کتابوں کے انتخاب میں غیر معمولی دقت کی ضرورت ہے۔ ہر ماہر علوم و فنون اس کام کو نہیں کر سکتا۔ قانون کے ذریعہ سے بھی کیریکٹر نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ قانون جرائم کی روک تھام ایک حد تک کر سکتا ہے۔ مگر جرائم نہ کرنے کی صلاحیت اور عمدہ خصلت نہیں پیدا کر سکتا کیریکٹر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی عمدہ کیریکٹر کے حامل میں دیانت امانداری۔ حق گوئی۔ حق پرستی۔ مستقل مزاجی۔ استواری۔ بنی نوع انسان سے ہمدردی۔ راست گوئی وغیرہ وغیرہ عمدہ خصائل پائے جاتے ہیں۔ عمدہ کیریکٹر کی بنیاد اصل میں فطرت سلیم ہے۔ جو مذہب کی اخلاقی تعلیم [illegible] اور سماج یا [illegible] کے اثر سے پختگی حاصل کرتی ہے۔ جیسے کا سماج جس کا خود ہی [illegible] بگڑا ہو۔ ہے وہ عمدہ کیریکٹر کے آدمی پیدا نہیں کر سکتا۔ عمدہ کیریکٹر کو [illegible] ترقی یا فروغ ہو سکتا ہے۔ یہ سماج ملک کی بربادی [illegible] ہے۔ ملک [illegible] صلاح و بہبودی کا اچھے سے اچھا منصوبہ اور بہتر سے [illegible] خرابیوں سے تباہ و برباد ہو جاتا ہے آج کل سماج کے [illegible] بگاڑنے والی سب سے زبردست چیز سینما ہے۔ سینما کا اصل مقصد دولت حاصل کرنا ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں پبلک کے سامنے لائی جاتی ہیں۔ محض ناچ گانے۔ اور مضحک حرکات سے حاضرین کو خوش کیا جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس تصویر میں نام پیدا کر لیا ہے وہ ملک کے بڑے بڑے [illegible] سمجھے جاتے ہیں۔

اور طرح طرح کے اعزاز انہیں عطا ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ناچ گانا یا سینما بجائے خود بری چیز نہیں ہیں یہ تمدن کے اہم عناصر ہیں اور انہیں نظر انداز رکھ کر ان کی ضرور اصلاح کرنا چاہئے۔ [illegible] میں تاریخی اخلاقی، معاشرتی سین دکھانا چاہئے جس سے دیکھنے والے کچھ سیکھ سکیں ٹوٹے پھوٹے دور از کار کہانیوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ایکٹنگ اور [illegible] بیتی نظر نہیں ہونے چاہئیں۔

کیریکٹر (Character) کی تعمیر کا وقت سات سال کی عمر سے لیکر پچیس ۲۵ سال کی عمر تک ہوتا ہے اس زمانہ میں لڑکے سادہ لوح ہوتے ہیں اور جو برا یا بھلا اثر اس زمانہ کو عمری کی طبیعت پر پڑتا ہے وہی مستقل اور دیرپا ہو اور ان کے آئندہ زندگی کے اخلاق کی جڑ اور بنیاد ہوتا ہے۔ اگر لڑکے صحیح راہ پر چلائے گئے اور مناسب تربیت دی گئی اور سماج کا بھی اچھا اثر ان پر پڑا رہا تو عمدہ کیریکٹر تعمیر ہو سکتا ہے۔ جو ۲۴ ۲۵ پچیس سال کی عمر کے بعد کیریکٹر کی تعمیر نہیں ہو سکتی جو رجحان ہو چکتا ہے اسی میں اضافہ اور اسی کو فروغ ہوتا رہتا ہے نئے کیریکٹر کی بنیاد نہیں پڑ سکتی ہے۔ طالب علم لکیر کا فقیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہماری موجودہ سماج کی حالت بہت افسوس کے قابل ہے۔ قریب قریب پورے سماج کا ڈھانچہ بگڑا ہوا ہے اور سماج کی حالت پیچیدہ ہو چکی ہے اب سدھر نہیں سکتی۔ یہ نہ تو کسی کے قابو کی چیز ہے اور نہ گورنمنٹ کے۔ اس کے اسباب جن کی تفصیل طول طویل ہے جو اس مختصر مضمون میں بے محل ہے۔ ایسی سماج سے یہ توقع رکھنا کہ آئندہ نسل کے اخلاق کو درست کرنے میں مدد کرے گی بالکل عبث ہے ـــــ ادھر طریقہ تعلیم کا کوئی اصول یا خاص مقصد نہیں معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ تر توجہ علمی کاموں پر ہے اور وہ بھی بہت سطحی طریقہ پر اخلاق اور روحانی تعلیم پر کوئی زور نہیں دیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ عملی زندگی اور جسمانی محنت اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں۔ مگر اخلاقی تعلیم و تربیت عملی زندگی کی جان ہیں۔ اس کے بغیر عمل محض قالب بے جان ہے جو طرح طرح کے فسادات پیدا کر سکتا ہے۔ جو کتابیں مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان کا بھی

کوئی اصول اور مقصد نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے انتخاب اور ان کے مضامین سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس اسکیم کے تحت میں وہ منتخب ہوئی ہیں یا اس اسکیم کے کس حصہ پر وہ خاص طور پر اثر انداز ہیں اور اخلاقی تعلیم اور تربیت کے لئے تو سارے نصاب میں کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔

لوگوں کے نام کے ساتھ ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی وغیرہ کی ڈگریاں لگی ہوئی ہیں۔ بے سمجھے بوجھے اُن سے کتابیں لکھوائی جاتی ہیں۔ اسی طرح بے سمجھے بوجھے کتابیں درج نصاب کردی جاتی ہیں۔ جو عمومی طور پر اخلاق اور کیریکٹر تعمیر نہیں کر سکتیں۔ انواع اقسام کے خیالات سے لڑکوں کے دماغ بھرے جاتے ہیں۔ جو ان کے دماغ میں بجائے یکسوئی کے انتشار پیدا کرتے ہیں اور کسی خاص شعبہ میں مہارت اور کمال حاصل کرنے میں ان کے سدراہ ہوتے ہیں ——— مختصر یہ کہ لڑکوں میں عمدہ اخلاق پیدا کرنا تعلیم کا اوّلین مقصد ہے۔ جس قوم کے افراد کے عمدہ اخلاق نہیں ہوتے وہ ساری قوم کو تباہ کردیتے ہیں۔ قلت یا کثرت آبادی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر کسی قوم کی مردم شماری زیادہ ہوتی ہے مگر اس کا کیریکٹر خراب ہوتا ہے تو وہ گھاس پھونس کے انبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اگر اس کی مردم شماری قلیل بھی ہوتی ہے مگر اس کے افراد عمدہ اخلاق کے حامل ہوتے ہیں تو باوجود قلت کے شل کوہ فولاد کے ہر طرح مشکلات کا مقابلہ استقلال اور کامیابی کے ساتھ کرسکتے ہیں اور نہ صرف قومی ہی قوت اور آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں بلکہ دوسری اقوام کی بھی سر دکر سکتے ہیں۔ اور اُن پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ اور دنیا میں شان اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ کسی کے دست نگر اور محتاج نہیں ہوسکتے بلکہ دوسروں کو اپنا دست نگر اور محتاج بنا سکتے ہیں۔ آج کل ہمارے دیس کے کیریکٹر کی خرابی پہلے سے زیادہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اور یہ خرابی زمانہ سابق کا ورثہ ہے مگر ملک کی آزادی کے غلط معنی سمجھنے سے اس میں روز بروز ترقی ہے۔ گویا قوم کے اصلی رجحان طبیعت پر سے روک ٹوک اور پابندیاں اٹھ گئیں اور وہ اپنی اصلی اخلاقی حالت کا آزادی کے ساتھ اظہار کرنے لگی۔ آزادی کو غلط معنی پہنانا اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا بھی کیریکٹر کی خرابی کا نتیجہ ہے۔

ایک کشمیری آزاد نظم

مترجمہ: زین العابدین

میں بغاوت کروں گا

میں آج بغاوت کروں گا
میں آج بغاوت کروں گا

رسومات اور بے جا رواجوں سے
طبلوں کی تھاپوں اور گھنگروں کی جھنکاروں سے
ناز اور نخروں سے
میں آج بغاوت کروں گا
مجھے تختِ شاہی سے بغاوت کرنی ہے
بنگلوں، محلات اور شیشہ خانوں سے
کن شیشہ خانوں سے؟
جن میں رہکر نوجوانوں کی آنکھیں اس طرح خیرہ ہوئیں
کہ اب وہ بات سننی تک گوارا نہیں کرتے
کہ اب وہ کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں
کہ اُن میں وہ سوچ نہ رہی
کہ اُن میں وہ سمجھ نہ رہی
کہ اُن میں امتیاز کی قوت رہی
میں آج بغاوت کروں گا
مجھے آج بغاوت کرنی ہے
لالچ، ہوس اور خوف سے
اُن چکلداروں اور سود خواروں سے
اُن غلّہ داروں سے

جو چور بازاری کرتے ہیں
جو قحط اور کال پڑنے پر خوش ہوتے ہیں
اُن نابکاروں سے
افراتفری اور طغیانی پر کمر باندھے ہوئے ہیں
جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں
جو جنگوں کے انتظار میں ہیں
اُن جنگ بازوں سے
موت کے ان بھیانک سایوں سے
مجھے آج ہزاروں اور لاکھوں خداؤں سے بغاوت کرنی ہے
آج ان کے نظام سے بغاوت کرنی ہے
جس میں بندے خود خدا بن جاتے ہیں
خود مالک بن جاتے ہیں
خود حاکم بن جاتے ہیں
جابر، قاہر اور ظالم بن جاتے ہیں
جو ایسا کرتے ہوئے دوسروں سے شرماتے نہیں
جو نہ خدا کا خوف کھاتے ہیں
جو آنے والی موت سے نہیں ڈرتے
جو موت کے بعد پھر بھی اُٹھنے پر خندہ زن ہیں
جو اس میدانِ حشر کا مذاق اُڑاتے ہیں
جہاں ہر ایک پھر اُٹھے گا

خطوط و نکات

سید انور علی

اپریل کا پرچہ موصول ہوا پڑھکر از حد خوشی ہوئی۔ ... صاحب کی غزلیں بھی مزا لے لے کر پڑھتا ہوں۔ لیکن گزشتہ پرچہ میں یہ دیکھ کر تردد ہوا کہ جس نے کل دار و رسن کی سمت مسکرا کر دیکھنے کا مشورہ دیا تھا اس کا آج یہ حال کہ

آج تک مسکرانے کی ہمت نہیں
ہم پہ گزرا ہے وہ دور ہمت شکن

معلوم ہوتا ہے انھوں نے بہت ہی ماضی بعید کے حالات کی عکاسی کی ہے۔ یاد رفتہ سے کنارہ کش ہونا بھی تو مشکل ہے لیکن اب تو انہیں اسی عزم کے ساتھ ہی دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے جس کی وہ دعوت دیتے ہیں۔

بہر حال بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ آج میں آپ کو چند خاص باتوں کی طرف متوجہ کرنے کے لئے خیالات لکھ رہا ہوں۔ مشیر۔ نئی نسلیں۔ چراغ راہ وغیرہ کے پرچے دسمبر تا مارچ آپ کی نظر سے گذر چکے ہوں گے۔ آج کل ہمارے مقالہ نگار تنقید کی طرف متوجہ ہیں لیکن میں ان کی تنقید میں وہ تبلیغی رنگ یا اصلاحی تنقید کی زبان اور انداز بیان نہیں پاتا جو ایک اسلامی ادب کے تنقید نگار کی ہونی چاہئے۔ اگر اسی طرح تنقید کا کام انجام پاتا رہا تو گروہ بندی کا ڈر ہے اور محض بے اعتدالی کی مرہون منت ہوگی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس طرف توجہ دیں۔ اور اسلامی ادب کے نقادوں کی ذمہ داریاں۔ انداز تنقید اور دوسرے اہم امور پر مفصل مقالات لکھکر دوسروں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ یہی اختلافی اس نوزائیدہ تحریک کے لئے مضر ثابت ہوگی

بعض لوگوں کے اندر یہ خامیاں اس وجہ سے ہیں کہ وہ تحریک اسلامی کی تمام ذمہ داریوں سے واقف نہیں ہیں اور نہ اس کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اگرچہ وہ خلوص نیت کے ساتھ اس سے وابستہ ہیں ضرورت اس کی ہے کہ انہیں مشوروں کے ذریعہ اس کی طرف متوجہ کیا جائے۔ بعض لوگوں میں نام و شہرت کی بے پناہ خواہش ابھر رہی ہے۔ انہیں ادیب یا شاعر کہلانے کی خواہش اتنی عزیز ہے کہ بیچارے سماج کے فرد ہونے کو ننگ سمجھتے ہیں۔ اپنی زندگی اور عمل کو ان اصولوں کا پابند کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے جن پر دنیا کی تعمیر کا عزم لیکر اٹھے ہیں۔ پتہ نہیں ان لوگوں کے پاس کونسی بصیرت ہے۔ جس سے وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ محض کمرے میں بیٹھکر شاعری کر دینے سے سماج کی برائیاں دور ہو جائیں گی۔ اس طرف ہمارے مقالہ نگاروں کو خاص توجہ دینی چاہئے اور ہمارے دوستوں کے ذہن میں یہ بات اتارنی چاہئے کہ اسلامی ادیب پہلے سماج کا ایک فرد ہے پھر اس کی ادبی صلاحیتیں تو یہ محض اس مقصد کے لئے ذریعہ ہیں اصل مقصد نہیں۔ اس کی قوتیں حصول مقصد کے ذرائع میں صرف نہیں ہوں گی بلکہ ذرائع اس کے مقصد کے لئے استعمال ہوں گے۔

میں نے کوشش کی کہ دوسروں کو بھی خط لکھوں اور اس طرف متوجہ کرکے فرمائش کروں لیکن میرا دل کسی سے مطمئن نہیں ہوا۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ ——— اس پر توجہ دیں اور وقت کی اہم ضرورت سمجھکر قلم اٹھائیں۔

رحمان خاور

معیار کا تازہ پرچہ نظر نواز ہوا۔ کافی اچھا اور ستھرا پرچہ ہے۔ اور مستقبل کے آثار امید افزا ہی نظر آتے ہیں۔ بہر نوع غالباً معیار میری نظر سے پہلی ہی مرتبہ گذرا ہے۔ دل چاہتا ہے۔ کچھ لکھوں۔ چونکہ دوستوں کے اصرار پر نیا نیا ہی رسائل کی دنیا میں آیا ہوں۔ اب یہ بھی خوف غالب ہے کہ مبادا آپ کا پرچہ بھی دوسرے ملک کے ذرا چلتے ہوئے پرچوں کے ڈھرے پر تو نہیں چل رہا ہے جن میں صرف وہی ادیب شاعر شمولیت کر سکتے ہوں۔ جو مشہور ہوں۔ اور پرچہ کی بکری اپنے قلم کے زور سے نہیں بلکہ اپنے نام کے زور سے کرا سکیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "معیار" ان تمام کھیڑوں سے پاک صاف ہوگا۔ اور نئے لکھنے والوں کو ... اپنے معیاری ہونے کا ثبوت دیتا رہے گا۔ میری مراد اس سے خدانخواستہ یہ بھی نہیں کہ نئے لکھنے والوں کی ہر چیز کو اپنا لیا جائے۔ نہیں۔ بلکہ معیاری۔